حکایات و اقتباسات

یہ کتاب سید سجّاد حیدر صاحب کے مختصر افسانوں او

مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے یعنی اسے "خیالستان" حصّہ دوم سمجھنا

تعداد صفحات ۲۳۶ .. .. قیمت عہ

ملنے کا پتہ

سید سجّاد حیدر صاحب بی اے ڈپٹی کلکٹر ہردوئی (یوپی)

منیجر صاحب مسلم یونیورسٹی بک ڈپو۔ علی گڑھ

دارالاشاعت پنجاب ۔ ۱۹۵ ریلوے روڈ۔ لاہور

شیخ مبارک علی صاحب ۔ تاجر کتب ۔ اندرونِ لوہاری دروا

لاہور

زہرا

یہ بھی ایک ترکی ناول کا ترجمہ ہے اور ترکوں کی معاشرت کا ایک اچھا

نہ قیمت ... ... ۸ر (طبع ثانی)

جلال الدین خوارزم شاہ

یہ ترکی زبان کے سب سے زیادہ مشہور ادیب نامق کمال بے کے ایک
المثال تاریخی ڈرامے کا ترجمہ ہے۔ ڈرامے کا زمانہ وہ جہاں آشوب عہد ہے
کہ چنگیز خاں ایک بلائے مبرم کی طرح دنیائے اسلام کو تباہ و برباد
تھا۔ ایک غیور و باحمیت بادشاہ جلال الدین اسلام کے لئے
فتنۂ محشر کے مقابلہ میں سینہ سپر ہوتا ہے۔ ڈرامے کا ہر صفحہ، ہر سطر،
اسلام، محبت وطن، الفت ملت کے جذبات عالیہ سے لبریز ہے
ان کے لئے اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ ترکی ادب کی سحر طرازی کا بہترین
ہے۔ کتاب چھپ کر تیار ہے۔

ت ۱۲ر

کھلی رہتی تھیں۔ عہد جمہوری میں، میں نے دوسرا ہی رنگ دیکھا۔ حکومت کے حکم سے۔ اور یہ حکم قطعی ہے۔ جس میں استثنار کی گنجایش نہیں۔ تمام بنک اور دکانیں جمعہ کے روز بند ہوتی ہیں یعنی اب حقیقی معنوں میں جمعہ یوم تعطیل ہے۔ صرف کھانے پینے کی دوکانوں کو کھلے رہنے کی اجازت ہے۔

اسی طرح جو ترکی رعایا نہ ہو وہ بنکوں اور دفاتر میں بحکم حکومت جمہوری نوکر نہیں رکھا جا سکتا۔ نیتجہ یہ ہے کہ ہر جگہ جہاں اول مسلمانوں کا نام نہ تھا ہر دفتر میں ہر بنک میں ایک معقول تعداد ترک مسلمانوں کی نظر آتی ہے۔

اور یہ تو دنیا جانتی ہے کہ معاہدۂ لوزاں کی رو سے یونان کی مسلمان آبادی ٹرکی میں لائی جا رہی ہے اور ٹرکی کے یونانی باشندے جو ٹرکی کی رعایا تھے لاکھوں کی تعداد میں یونان بھیجے جا رہے ہیں۔ مسلمان۔ مہاجرین ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں ٹرکی میں آ رہے ہیں اور اسی تعداد میں غیر مسلم عناصر کم ہو رہے ہیں اور اس واقعہ سے ملک کی زندگی میں جو تغیر عظیم پیدا ہو رہا ہے اس کا اندازہ مشکل ہے۔

تمام شد

بڑھی ہوئی ہے کہ ترک اس وقت اس کے خلاف ہیں کہ کوئی حج کو جائے۔ مجھے
یقین ہے کہ یہ تشدد عارضی ہے اور تھوڑے دنوں میں ان خیالات میں نرمی آجائیگی۔

حکومت کا رعب اس وقت اس قدر غالب ہے کہ یہاں کوئی شخص "خلافت" کا نام بھی نہیں لیتا۔ جو حضرات مجھ سے گفتگو کرتے ہیں میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں اس معاملے کے متعلق عام رائے کیا ہے مگر نہیں پوچھتے۔ ٹرکی سے باہر جتنے ترک مجھے ملے تھے، انھوں نے اس کے متعلق مجھ سے نہایت آزادی سے بحثیں کیں مگر یہاں خاموشی ہے۔

حق پوشی ہوگی اگر موجود جمہوری حکومت کی (جس نے دین و حکومت کو علیحدہ کر دیا ہے) چند اصلاحات و احکامات کا ذکر نہ کیا جائے۔ جس سے اس "بیدین" حکومت کا طرزِ عمل ایک غیر متوقع جلوہ دکھاتا ہے۔ زمانۂ خلافت میں یہاں یہ سماں نظر آتا تھا کہ اتوار کے دن تمام بازار بند ہیں۔ اکثر دفاتر بند ہیں اور جمعہ کو بازار کھلے ہوئے ہیں، وجہ اس کی یہ تھی کہ بنک اور تمام بڑی بڑی دکانوں کے بند ہونے سے ایسی کساد بازاری ہوتی تھی کہ مجبوراً اس روز مسلمان بھی دوکانوں کو بند کر دیتے تھے برخلاف اس کے جمعہ کو دوکانیں

ہر ملک و قوم کی طرح، ترکوں میں بھی ایک انتہا پسند گروہ ہے۔ یہ لوگ
عرب، اہلِ عرب، مدنیت عرب سے ایسی بیزاری ظاہر کرتے ہیں کہ خیال ہونے
لگتا ہے کہ وہ دینِ عرب سے بھی بیزار ہیں اس وقت اس انتہا پسند گروہ کے
خیالات کے ترجمان واصف بک ہیں جو وزیرِ تعلیم ہیں۔ الغائے خلافت میں ان
کا سب سے زیادہ حصہ ہے۔ کہنہ خیال علماء کو وہ چین سے بیٹھنے نہیں دیتے۔ طرزِ
قدیم کے مدارس کو انہوں نے بجبر بند کرا دیا حال میں معلمین ٹرکی کی ایک کانفرنس
ہوئی اس میں انہوں نے کہا کہ مدنیت عرب نے ترکی قوم کی شخصیت کو مٹا دیا
ہمیں اس کی غلامی سے آزاد ہونا چاہیے۔ ہماری زبان، ہماری معاشرت سب
کچھ تمدنِ عرب نے ہضم کر لی۔ دو دن ہوئے کہ خود مصطفےٰ کمال پاشا نے
ایک تقریر میں یہ خیالات ظاہر کئے "جنگ استقلال میں (یونانیوں سے جو جنگ
ہوئی ہے اُسے ترک جنگِ استقلال کہتے ہیں) ملت نے اپنی وراثت حاصل کی۔
قوم اپنے اوپر خود حکومت کرنے کے لیے آزادی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ گئے
وہ دن جبکہ سلطان، خاقان، خلیفہ، غیر ترکی عناصر کی مدد سے ترکی قوم کو
دبا کر حکومت کرتے تھے۔"

غیر ترکی عناصر سے اشارہ زیادہ تر عربوں کی طرف ہے۔ نفرت اس درجہ

جرمنی میں ایک انگریز سے ملاقات ہوئی جو حال ہی میں سفرِ قسطنطنیہ سے واپس آئے تھے، چونکہ میں بھی اس سفر پر جانے والا تھا اس لیئے قدرتی طور پر میں نے ان سے وہاں کے حالات پوچھے تاکہ مجھے سفر میں آسانی ہو، اُنہوں نے کہا کہ اس وقت تُرک نیشنلزم (قومیت) کے نشے میں سرشار ہیں۔ میں نے اس وقت تو یہ سمجھا تھا کہ یہ ایک مبالغہ آمیز رائے ہے مگر خود یہاں پہونچکر مجھے اس رائے کی صداقت میں ذرّہ برابر بھی شبہ نہیں رہا تُرک اِس وقت نہ صرف اس نشے سے مست ہیں بلکہ روز بروز اس مئے دو آتشہ کے زیر اثر مدہوش تر ہو رہے ہیں۔

تُرکیت کی پرستش کی جارہی ہے اور اس پرستش میں وہ مذہبیت حجازی پر بعض اوقات سخت حملے کر جاتے ہیں جو میری طرح باہر کے مسلمانوں کو بہت گراں گذرتے ہیں۔ وہ اس وقت عرب کا نام نہیں سُن سکتے اور حق یہ ہے کہ گذشتہ جنگِ عمومی میں عربوں سے جو ضربۂ عظیم ان کے سر پر پڑا ہے اس نے انھیں بالکل بیجان کر دیا تھا وہ محو ہو چکے تھے۔ خدا کو اپنی قدرتِ کاملہ دکھانی منظور تھی کہ اس نے مردہ ٹرکی کو پھر زندہ کر دیا اور اس طرح زندہ کیا کہ وہ ایک جوانِ رعنا کی طرح بلوان ہے۔

یہاں کے تمام مدارس اور مساجد دیکھیں، کمال اخلاق سے ہر اسکول کے
منیجر نے مجھے اسکول دکھائے اور وہاں کے حالات بتائے۔ سامی
ایک، دن بھر میرے ساتھ رہے، شام کو "جمہوریت" کے ایک کارسپانڈنٹ
نے آکر مجھ سے ملاقات کی، اور اس ملاقات کا مفصل حال "جمہوریت"
میں چھپوایا، میں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے متعلق تفصیلات بیان کیں اور
بتایا کہ ہندوستان میں کئی یونیورسٹیاں ہیں طریقِ تعلیم کیا ہے وغیرہ وغیرہ

"جمہوریت" استنبول کا ایک روزانہ پرچہ ہے،

استنبول میں دو دن تو میں تنہا، کس مپرسی کی حالت میں رہا۔ مگر میں
احسانمند ہوں کہ استنبول میں ہندوستان کے ہندوستانیوں نے مجھے ڈھونڈھ
نکالا اور مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا، استنبول میں دس بارہ ہندوستانی ہیں جن میں
سے ایک سکھ بھی ہیں الحمد للہ کہ ایک ہندوستانی یہاں بہت باعزت ہیں، یہ
عبدالرحمٰن ہیں جو ڈاکٹر انصاری صاحب وفد ہلال احمر کے ساتھ جنگ بلقان
میں آئے تھے، اور یہیں رہ پڑے، یہ علی گڈھ کالج کے تعلیم یافتہ ہیں لہذا
عبدالرحمٰن (علیگ) ہیں اور اتنا کہدینا کافی ہے کہ محبت مروت، اخلاق
میں یہ استنبولی علیگ ان محاسن کا مجسمہ ہے۔

[می]ں قدم رکھتے ہی، یہ تغیر جلبِ نظر کرتا ہے۔

میں ایڈریانوپل میں صرف ایک دن رہا، مگر حق یہ ہے کہ ایڈریانوپل والوں [نے] غریب نوازی، مسافر پروری کا پورا حق ادا کر دیا۔ میں ہوٹل میں اُترا [ہ]ی تھا، کہ پولس نے (جس نے اسٹیشن پر میرا پاسپورٹ مجھ سے لے لیا تھا) [و]لایت آدرنہ کے حبیب بے، مدیر معارف (ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن) کو [خ]بر دیدی کہ ہندوستان کی مسلم یونیورسٹی کا ایک آدمی آیا ہوا ہے مدیر [مع]ارف نے فوراً ایک شخص میرے پاس بھیجا کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں [و]قت مقرر کیجیئے میں بجائے وقت مقرر کرنے کے اس شخص کے ساتھ ہو لیا [او]ر میں نے کہا کہ میں خود اُن کے پاس جاؤنگا۔ دائرہ حکومت (گورنمنٹ [ہا]ؤس) میں، حبیب بے نے مجھ سے بے انتہا اخلاق کے ساتھ ملاقات فرمائی [ہن]دوستان کی تعلیمی حالت کے متعلق سوالات کرتے رہے اور میں ٹرکی [او]ر ولایت ایڈریانوپل کی تعلیمی حالت کی نسبت پوچھتا رہا۔ اس کے بعد [حب]یب بے نے اپنے دفتر میں سے ایک صاحب کو بُلا کے میرے ہمراہ کر دیا [کہ ا]نھیں آدرنہ کے تمام اسکول دکھاؤ، چنانچہ میں نے ان صاحب کی اور [ا]یک مدرس علومِ طبیعہ و اسسٹنٹ منیجر ہائی اسکول آدرنہ کی معیت میں

ترکی فوجی افسر، یوروپین فوجی ٹوپی سے نہایت مشابہ ٹوپی پہنے ہوئے ہیں، لیکن اس میں چھجا نہیں، اور اس طرح اسے نصرانی ٹوپی سے ممیز کر دیا ہی۔ سب سے زیادہ تغیر، جو آنکھ کو فوراً محسوس ہوتا ہی یہ ہے کہ کلیاں پھول ہو گئی ہیں، غنچے جو گھنڈیوں میں بند تھے، چٹک کر باہر نکل آئے، یعنی ترکی خاتونوں نے نقاب چہروں سے ہٹا دیا ہے، اور اب وہ ترکی کی حیات مشترک میں شریک غالب نہیں تو شریکِ مساوی ضرور ہیں، پاؤں سے لیکر گردن تک لباس، بالکل یوروپین لباس ہے پیرس کے تازہ ترین قطع و فیشن کو دیکھنا ہو تو ترکی خاتون کو دیکھیے لیکن ابھی تک مرد اور عورت ایک بات پر سختی سے قائم ہیں، انگریزی یا یوروپین ٹوپی نہ مرد پہنتے ہیں نہ عورتیں، عورتیں سر پر نہایت خوبصورتی سے رومال، باندھتی ہیں، جو اتنا مقبول ہوا ہے کہ میں نے یہاں بعض یوروپین عیسائی عورتوں کو اس کی تقلید کرتے دیکھا، ایک اور بات پر نظر اٹکتی ہے، ترکی خاتونیں بلا استثنا چشمہائے سرمہ آلود سے آپ نظر ڈالتی ہیں۔

بہیں ظالم حیا کر دی بلا اندر بلا کر دی

میں نے اور باتوں کا ذکر نہیں کیا، اور شروع ہی میں ترکی خاتون کے متعلق لکھنا شروع کر دیا، اصل یہ ہے کہ یہ تغیر اس قدر عظیم ہے کہ قسطنطنیہ

من اندازِ قدت را می شناسم

سلطنت ہو یا خلافت، مشروطیت ہو یا جمہوریت ہم تو تیرے پرستارانِ
قدیم میں سے ہیں صبح کے وقت ٹرین قرہ آغاج پر ٹھہری، یوروپ سے آنے والے
لوگ ادرنہ (ایڈریانوپل) کے لیے اس اسٹیشن پر اترتے ہیں، میں ٹرین سے
نکلا اور خاکِ عثمانی، (توبہ توبہ بڑی غلطی ہوگئی، کہیں کوئی جوشیلا ترک اس
عبارت کو نہ دیکھ لے لفظِ عثمانی ممنوع ہے) خاکِ ترکی پر قدم رکھا ادرنہ نے
میرے گذشتہ سفرِ ترکی کے بعد کیا کچھ نہیں برداشت کیا۔ یلغار بلغاری، یونانی
ستم رانی اس کے نصیب میں تھی لیکن آج پھر وہ اپنے وارثوں کے پاس ہے
ایک دن ادرنہ میں ٹھہر کر، میں دوسرے دن شام کو استنبول، قسطنطنیہ،
درِ سعادت (جو چاہیے کہیے مگر خبردار دارالخلافت نہ کہیے گا) پہونچا۔

میرے سفرِ اول، اور اس سفر کے درمیانی زمانے میں یہاں کی زندگی
میں کسقدر عظیم فرق ہوگیا ہے۔

استنبول اور پیرا کو ملانے والا، پل جو شاخِ زرین پر کشتیوں کا بنا ہوا
ہے، پہلے معمولی بلکہ ادنیٰ درجہ کا تھا، اب نہایت نفیس اعلیٰ صنعتکاری کا نمونہ
ہے، مگر سڑکوں کی وہی حالت ہے، شکستہ و ریختہ،

قسطنطنیہ

مقامِ جمہوریت

سنہ ۱۹۲۴ء

پھر وہیں لے چلا مجھے دیکھو ؎ دلِ خانہ خراب کی باتیں

دیارِ مغرب کی سیاحت ختم ہوئی۔ آنکھوں نے سب کچھ دیکھا، آثارِ قدیمہ تحریکاتِ جدیدہ سکونِ ناآشنائی، گام زنی شبانہ روز ساتھ ہی پرستشِ زر، غرورِ مدنیت امتیاز و تحکمِ نسل و قوم، ان سب نے دل پر گہرے اثر چھوڑے ہیں۔ ہاں اے یوروپ،

گفتگو آئین درویشی نبود ورنہ با تو ماجراہا داشتیم

اب اپنے محبوب، شرقِ قریب کی کشش، مجھے مغرب کی طلسماتی، سیمابی زندگی سے چھڑا رہی ہے، افق پر ہلال مجھے ہلالِ باسفورس کی یاد دلا رہا ہے اور، کہنہ شہر بائزنٹائن[1]! تیری جاذبیت ناقابلِ مقاومت ہے، بارہ سال قبل تو نے مجھے بلایا اور میں افتاں و خیزاں "لبیک لبیک یا حبیبی، یا محبوبی" کہتا ہوا، پہونچا ترے اشارۂ ابرو نے پھر مجھے بیتاب کر دیا، سلطنت، مشروطیت، خلافت، جمہوریت! تیری ہر ادا بانکی ادا ہے،

---

[1] قسطنطنیہ کا پرانا نام۔

جس طرح کسی دوسرے سیارے کا باشندہ ہمارے حرکات کو بے پروانہ انداز سے دیکھتا ہوگا، اُسی طرح میں اس ہجوم کی حرکات پر نظر ڈال رہا ہوں انداز بے پروایانہ ہو، مگر نظر رشک آمیز ہے۔

ساحل دور ہو گیا، دوربینیں آنکھوں پر لگ گئیں، جنھوں نے بمبئی کے دل آویز منظر کو قریب لا کر دکھانا شروع کیا۔ جہاز کے طاقت ور انجنوں نے یہ منظر بھی آنکھوں سے اوجھل کر دیا۔ اب صرف حدِ اُفق تک، نیچے سمندر کی نیلگوں سطح ہے، اور اُوپر آسمان کا نیلگوں شامیانہ۔ اب ہماری دُنیا اس مرکب بحری سے مراد ہے۔ کم از کم ایک ہفتہ کے لیے، خشکی کی دنیا کی جنگ و جدل صلح و آشتی، کوشش ہائے پُر ارمان، نتیجہ ہائے پُر حرماں سے ہم بے خبر رہیں گے عدن پر کچھ گھنٹوں کے لیے، دنیا سے رشتہ جڑے گا، اور پھر وہی بے تعلقی۔

اے دوست، بیا، رحم بہ تنہائیٔ ماکن!

ہجوم میں تنہائی

مئی سنہ ۱۹۲۴ء

دوست، دوست سے، محبوبہ عاشق سے، یا بالعکس، عاشق محبوبہ سے جدا ہو رہا ہے۔ ہار پہنائے جا رہے ہیں، گلدستے پیش کیے جا رہے ہیں۔ لنگر اُٹھا۔ جہاز آہستہ آہستہ ساحل سے ہٹنا شروع ہوا۔ رخصت کرنے والوں کی، ساحل اور ڈک پر صفیں کھڑی ہو گئیں۔ رومال کبھی آنکھوں پر جاتے ہیں، کبھی ہلتے ہیں؛ کوئی مسکرا مسکرا کر جانے والے کو ساحل پر بلا رہا ہے، جانے والا ساحل کے دوست کو اشارے سے ڈک پر آنے کی دعوت دیتا ہے۔ پُرنشہ وداع، حزیں فراق، دونوں یہاں موجود ہیں۔ جہاں ہر طرف مصافحے، معانقے ہو رہے ہوں وہاں اپنا ہاتھ جیب میں ہونا بھی عجیب دل پر اثر کرتا ہے۔ ہجوم میں تنہا ہوں!

ان سینکڑوں رومالوں میں، میرے لیے ایک میں جنبش نہیں۔ اور نہ میرا ہاتھ، رومال کو اُس کے آرام کی جگہ سے، کسی کے لیے باہر لانے کی کوشش کرتا ہے۔

ہجوم سے بے زار ہو کر، کیا تمہاری تنوع پسند طبیعت (اور کون سا ذکی الحس انسان ہے جو تنوع پسند نہیں؟) گیسوئے زر تار اور چشم نیلی فام کو یاد نہ کرے گی؟

پھر وہ حسن ایسا ہی ہوگا نا جو نظر ربا ہو، جو نکتہ چیں آنکھ سے بھی قبولوائے کہ بے عیب ہے، لیکن وہ حسن تو نہ ہوگا جس میں شاعریت، احساسِ جاذبیت اور ہمدردی بھری ہوئی جو تمہارے خیالات سے متحس ہو، اور اپنے خیالات سے تمہیں متحس کرے، اپنے اشعار کس کے لیے لکھو گے، وہاں شاعری درکار نہیں، حسن مغرور تمہیں پسند تھا، اور میں اپنی کشش اور خوبی سے بے خبر حسن کا شیدائی تھا، ہم میں اس کے متعلق بحثیں رہتی تھیں گو یہ میں سمجھتا ہوں کہ میں اپنی رائے تم سے منوالونگا، مگر یہ کیا؟ تم اُس نامعقول حسن کے جو نہ مغرور ہی نہ بے خبر، بلکہ جو زیبائی و درشتی کی تمیز ہی نہیں رکھتا، دل دادہ نکلے!

ایک دوست کی خبرِ وفات سن کر

سنہ ۱۹۰۹ء

میں تم پر بے وفائی کا الزام نہیں لگاتا، کیوں کہ ہم اب بھی جدا اور ایک دوسرے سے دور تھے؛ بدعہدی کا ملزم نہیں ٹھیراتا، کیوں کہ ہمیشہ ساتھ رہنے کا ہمارا تمھارا کوئی عہد و پیمان نہیں ہوا تھا؛ مگر اے دوست، سکوت و کوتاہ قلمی کا الزام لگاتا ہوں۔ میرے خط کا جواب تو دو ہماری بحثیں ابھی ناتمام ہیں۔ میں نے اپنے دلائل تمھیں لکھ کے بھیجے ہیں، اُنھیں رد تو کرو۔ کیا ہار مان گئے؟ ہم تم ویسے ہی ایک دوسرے سے بہت دور تھے اس سے بھی زیادہ دور چلنے کی کیا ضرورت تھی؟

اگر تم اپنے خیالات، اپنے حسیات مجھ سے چھپاتے نہیں رہے، تو میں کہہ سکتا ہوں تمھیں دو چیزوں سے الفت تھی، حسن اور شاعری، تم سا حسن پرست اور شاعریت دوست وہاں بھی کیا حسبِ دل خواہ اپنے اشتغال میں مصروف رہ سکے گا؟ مانا کہ حسن وہاں بھی تمھیں نظر آئے گا اور مکمل حسن، لیکن کیا حورِ عین تمھاری نقّاد طبیعت کو بہلا سکے گی؟ سرمگیں آنکھوں، عنبریں زلفوں کے

وہ موت کے ڈراونے چہرے سے اُلفت کرتے ہیں۔

اے کمال کی، اے مدحت کی ماں! اے فاتح! اے سلیم کی آغوشِ خواب!

اگر تیرے پاک گوشوں میں تیری منزہ وصاف محرمیت میں کسی بے ادب کا قدم داخل ہو جائے، تو ہم سب، ہمارا سرفروش انور، ہمارا بہادر نیازی، (ہمارا مصطفےٰ کمال اعظم) ہماری شیر فوج کے ساتھ مرد عورت، یتیم بچے، سب کے سب اُس نجس اجنبی قدم کو تیرے پاک سینے سے ہٹا دیں گے لیکن اگر نہ ہٹا سکیں تو ہم تیرے سب سے گہرے گڑھے میں گڑ جائیں مگر اس وقت تو ہمیں ایسا گہرا گاڑیو کہ تیرے نرم سینے میں دشمن کے ناخن پڑیں تو ہمیں احساس نہ ہو۔

نہیں نہیں، اگر تو ہماری ماں ہونے سے گریز کرتی ہے تو تو بھی ہماری طرح محو ہو جا۔ اپنے شاندار محلوں، اپنے اونچے گنبدوں، اپنے پُراسرار جنگلوں، اپنے شاداب مرغزاروں سمیت محو ہو جا۔

قعرِ دنیا کی سب سے تاریک، سب سے دور تنہائی میں جا سو۔

نہ انسان کے حافظے میں، نہ کتابوں کی سیاہ تحریر میں تیرا نام ونشان باقی رہے۔

ہم سب کے ساتھ، تو بھی اُن معموروں کو لیکے جو راکھ ہو چکے ہوں، گمِ عدم میں چھپ جا۔

جان دینے کے لئے اور اپنی ہڈیاں تجھے سپرد کرنے کے لئے صدہا سال تک غربت زدہ آبلہ پا، رہ پیما، خستہ اور اُس پر بے یار و مددگار ترک آئے گا۔

اس خطرناک زمانے میں، وہ باعظمت ترک فاتح جو تیرے لئے شہید ہوئے اور جنھوں نے تیرے لے مرنا ہی اپنی مکافات سمجھی، ان کی روحیں تیری لطیف ہوائیں، تیرے افق پر جہاں دشمن کے تاریک سائے پڑ رہے ہیں پھر رہی ہیں۔ ماضی کی وسعت میں سے یہ خاموش، گرد و قورد معظم روحیں آرہی ہیں اور تیرے زندہ فدائیوں کی بلند پیشانیوں کو اپنے پرّاں بازوؤں سے مَس کرتی ہیں۔

ہماری قسمت میں اگر جینا ہی، تو تیرے لئے جینا ہی، لیکن اگر قسمت میں یہ ہی کہ ہمارے قلب کے نازک ترین احساسات کو دشمن اپنے ہاتھوں سے ٹھیس لگائے۔ تو بہتر یہی ہی کہ ہمیں مار ڈال اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اے تیرہ خاک! اپنے میں دفن کرلے۔

اے مادرِ وطن! جو دن تیرے لئے خطرے کا دن ہو، اُس دن وہ معصوم سر جو پالنے میں بلند ہو رہے ہیں، اُن سے لے کر اُن کہنہ کمروں تک جو مزار کی طرف جھک رہی ہیں سب اپنا خون تیرے لئے بہانے کو تیار رہیں۔ اُس دن

تجھے پامال کیا، تیری ہڈیاں توڑیں، کن درندوں نے اپنے ناخنوں سے تجھے مجروح کیا۔

اے مادرِ وطن! تو جو نیلی موجوں کی آغوش میں سو رہی ہے۔ تو جس کے پہاڑوں کے خطوطِ نازک، جس کا سایۂ رنگین، جس کا افقِ رنگین، جس کا سما شفق گوں، جس کی سحرِ لطیف، جس کے بادلوں کی رفتار دلبر و غشی آور ہے تو ہمیں یتیم چھوڑ کر کن بیگانہ آرزوؤں کے تعاقب میں جا رہی ہے۔

سن! تجھے نہ محتشم قدیم روما، نہ فیلسوف قدیم یونان نے، ایسے وفاکار، ایسے آتشیں، ایسے نفسِ واپسیں تک کے جذبے سے چاہا ہے جیسا ہم چاہتے ہیں اور نہ کوئی قوم مستقبل میں چاہ سکتی ہے۔ ترکوں کی سب سے زیادہ دل دوز خشوع و تضرع، ترکوں کے منزہ و مجرد امید و استغراق تیرے لئے ہیں۔ ترک تیرے لئے زندہ رہتا ہے، تیرے لئے مرتا ہے، تیرے لئے برباد ہوتا ہے، تیرے لئے آہ و زاری کرتا ہے۔ سب تیرے لئے۔

کسے معلوم ہے کہ تیرے خمیر میں کتنے ترک شہدا کا خون ہے جنھوں نے اپنے قیمتی قطرہائے خون تیرے سینے پر گرائے۔ کتنے ترک سپاہیوں کی ہڈیاں ہیں، جنھوں نے اپنی جان دشاں تیرے قدموں پر فدا کر دی۔ تیرے سینہ پر

اے مادرِ وطن

اک ترک کا خطاب اپنے وطن سے

تیرے بچے، مصیبت و فلاکت کے سمندر کی سب سے زیادہ تاریک گہرائیوں
میں ڈوب رہے ہیں، اُن کے سینوں سے خون کے فوّارے نکل رہے ہیں،
اور وہ دل خون اور سینہ چاک تیرے مبہم مگر نرم قلب میں جمع ہوئے ہیں۔
اپنے سینہ کو کھول، اے تیرہ خاک! اور اپنے شہیدوں کے لئے جنھوں نے
تیرے چھوٹے سے روڑے کی خاطر، لمبے لمبے زخم کھائے مگر دشمن کو تجھ سے
دور رکھا، ہمارے بہادر آبا و اجداد کے پہلو میں جگہ تیار کر۔

تیری متروک، تیری خشک، تیری فراموش شدہ پتھریلی وادیوں کو
سفید ریش بڈھوں سے لے کر معصوم ترک بچّوں تک کا اپنے آنسوؤں سے
تر کرنا کیا کافی نہیں ہے؟

کیا تو ہم سے ناراض ہو گئی، اے مادرِ وطن؟ اس بے گناہ، اس
مردِ قوم سے نہ پوچھ کہ کن قزاقوں نے، کن خائنوں نے اپنے پاؤں سے

قفس ہی میں دم توڑا۔ اُس چند گز نیل گوں آسمان کے سوا جو اُس کے صحن خانہ پر حسرت بار رہا، اُس نے فطرت کی زیبائش، آفریدۂ دستِ انسان کی آرائش نہ دیکھی، آفتاب جو دنیا کو زندگی اور حرارت بخشتا ہے قفس کی تیلیوں سے لپٹے ہوئے کپڑے سے گزر نہ سکا۔ لیکن خود اُس کے قلبِ منور نے ایک شمع روشن کی جس نے اُسے باہر کے نور سے بے نیاز کر دیا۔ شمعِ تخیل!

وہ اپنی مختصر مگر متجلی زندگی میں اپنے تئیں "خاک نشیں ز۔ خ۔ ش" کہا کی۔ آج حقیقتاً وہ خاک نشینی کی آرزو مند آسودۂ خاک ہے۔

"خوش درخشید مگر شعلۂ مستعجل بود"

ز-خ-ش[1]

وہ عندلیبِ خوش الحان جس کے عرفان پاش نغمے اُس کی قفس کی تیلیوں سے نکل نکل کے ایک عالم کو مسحور کر رہے تھے، یکایک خاموش ہو گئی۔ نغمے فضا میں متلاطم ہیں، مگر عندلیب ہمیشہ کے لئے ساکت۔

وہ حقیقت طراز مگر شیریں آواز سراپردۂ دولت کے پیچھے سے (جہاں سے بے معنی خندہ اور فضول مکالمہ کے سوا کچھ کم سُنائی دیتا ہے) سنا رہی تھی کہ صدق و صفا، علم و عرفان، سوز و التہاب، درد و گداز کیا ہیں۔

اور صدق و صفا، علم و عرفان، درد گداز سوگوار ہیں کہ ان کی مشاطہ اُن کو دلآویز آرائشوں میں اب پیش نہ کرے گی۔

وہ ایک عندلیب تھی جو قفس میں پیدا ہوئی، قفس میں جی اور اُس نے

---

[1] اُردو کی وہ مشہور شاعرہ جس کی حیرت انگیز قادر الکلامی طبقۂ نسواں کے لئے باعثِ صد افتخار تھی اور جس کی بے وقت موت نے اُردو علم ادب کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ مرحومہ عالی جناب نواب مزمل اللہ خاں بہادر او بی ای کے سی آئی ای رئیس بھیکم پور کی چھوٹی صاحبزادی تھیں۔

معبدِ؟ معبدِ عشق۔ جہاں چار آنکھیں اشاراتِ محبت کر رہی ہوں اور دعوتِ عشق
دے رہی ہوں، وہاں میں نے دو آنکھوں میں ضرور دھوکا اور خیانتِ پنہاں
دیکھی۔ جہاں دو ہاتھ ایک دوسرے کو محبت سے دبا رہے ہوں وہاں ایک
ضرور دوسرے کو فریب دے رہا ہے۔

طفلی و عشق کے ویران معبدوں کو چھوڑ کر میں آگے بڑھا، افکار و احساسات
کے نادیدہ واقفوں کی طرف، زندگی ڈراونی تیزی کے ساتھ مجھے لے گئی اور
میں نے دوسروں کے معبد کے دروازوں میں سے اندر جھانکا۔ مگر میری نگاہ نے
نہایت گہرے پردوں میں سے گزر کر دیکھا تو یہ دیکھا کہ ہر جگہ ویران معبدوں کے سوا کچھ
نہیں۔ ہر قلب نے یہی کہا کہ میں کبھی تجلی گاہِ ارمان تھا۔ کبھی! اب نہیں وہ علوم
جن کے لئے حکماء سر کھپا رہے ہیں وہ سوز و گداز بشری جن کی ترجمانی شعراء
کرتے رہے ہیں، دوستی، عشقِ دین، فکرِ بشر، سب کے سب آخر میں دیکھے تو
ویران معبد ہی نظر آئے۔ دماغ و قلب کے ویران صنم خانے! اب ان میں
حسرت و یاس و تمنا سیر کرتے ہیں۔

عشق و محبت کے بت! ان فانی معبودوں کے لئے کون ہی جس نے معبد نہیں بنائے۔ صنم خانۂ عشق بھی کیسا رنگین ضیاء دار، معطر صنم خانہ تھا وہ کیسے صاف شفاف قبۂ بلور کے ذریعہ تاروں کی چمک، شفقوں کے رنگوں کو بڑھا بڑھا کر اپنے میں لیتا تھا اُس کے حجروں میں سے جو نغمے سنائی دیتے تھے وہ ایک دوسرے سے محبت کرنے والے دلوں کے ترانے تھے۔ اس معبد میں وہ نوجوان جمع تھے جو پھولوں سے لدے پھندے تھے جن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور جن کی روح عشق کی وجد سے رقصاں۔ مگر اس کی محراب میں میں نے ایک نوجوان دوشیزہ دیکھی جس کا چہرہ سالہا سال کے انتظار سے اپنی تروتازگی غائب کر چکا تھا جس کی آنکھوں میں حزن و ملال نے مستقل طور پر جگہ کر لی تھی۔ یہ بے وقوف لڑکی اپنے حبیب کا انتظار کر رہی تھی جو اُسے کبھی نہ ملے گا۔ اس نے میرے سامنے جان توڑ دی، اور میں نے اُسے معبد کے دروازے میں اندر دفن کر دیا تاکہ وہ روندی جائے۔ اُن شیشے کے ٹکڑوں کو جنھیں وہ بلور سمجھے ہوئے تھی۔ میں نے اُس کے مدفن پر ڈال کر ایک نہایت سیاہ اور نہایت موٹی چادر سے اسے ڈھانپ دیا۔

سب سے بیہودہ، سب سے زیادہ مضحک اور سب سے زیادہ دھوکا دینے والا

ایک تازہ مسرت انگیز لرزش حیات بخشتا تھا اور ہم ایک غیر اختیاری وجد کی حالت میں گویا سجدہ ہائے پرستش کرتے تھے۔

ہمارا پہلا معبد: معبد طفلی! چند سال ہم نے تیرے گنبد کے نیچے پرستش میں گزارے، تیری پوجا کی۔ بعد میں جب دوسرے معابد میرے سر پر آآ کر گرے اور میری روح پریشان اور ناامید ہوئی اور میرا دل کسل اور فتور سے بھرا تو میں نے ہمیشہ تیری قندیلوں کی روشنیوں میں جا کر پناہ لینے کی کوشش کی۔ مگر آہ! تو بھی ان معبدوں ہی کی طرح بے جان و خاموش ہو گیا۔ تیری قندیلیں میری روح تک نہیں پہنچتیں۔ تیری نسیم لوریاں نہیں لاتی، بلکہ وہ اب ایک نابینا قدرت کا جھکڑ ہے جو درختوں کو اکھاڑتا ہے نشیمنوں کو ویران کرتا ہے۔ تیرے آبشاروں سے اب کوئی موسیقی پیدا نہیں ہوتی، بلکہ وہ ایک آوازۂ یاس ہے جو یتیم انسانیت کے جگر سے نکل رہی ہے یا وہ انسان کی صدائے الامان ہے جسے کہیں امان نہیں۔ ہاں تجھے بھی خراب ہونا تھا اے معبد! تو خراب ہو ہی چکا۔ تیری قندیل بجھ گئی اور تیرے مرغزار سوکھ گئے تیرے معطر و سرسبز حصے تپتے ریگستان ہو گئے تو بھی ایک تاریک اور ویران عالم ہو گیا۔ اس کھنڈر میں بیٹھ کر میں اپنے معبد کا ماتم کر رہا ہوں۔

کوئی معبد ایسی آہنگ شیریں سے بھرا ہوا نہیں، نہ کسی کی زمین پر ایسی چکاچوند
کرنے والے رنگوں سے پچی کاری کی گئی ہے اور ہاں کوئی پرستش گاہ ایسی نہیں
جہاں عظمت و قدرتِ الٰہی کے ساتھ غضبِ الٰہی ایسے سیاہ رنگوں ایسی خوف
آوازوں سے قلب پر مستولی ہوتا ہو۔ کونسا معبد ہے کہ جس کی دیواروں کے اندر
معبود ایسا ضیا دار ہو اور اس ستاروں بھرے مزین عبادت گاہ میں خودبخود
چمک رہا ہو۔ اور روز افزوں لذتِ حیات سے متلذذ ہو۔

رات کو تیری متبسم اور ساکت قندیلوں کے سائے میں تیری مدّھم اور مبہم
روشنیوں میں کائنات کی تھکی ہوئی آواز کو سن سن کر ہم سوتے تھے، اور دن
تیرے اس نور میں جاگتے تھے جو فضا کو روشن کئے ہوئے ہوتا تھا اور کائنات
کے ساتھ ہمیں بھی آغوشِ نور میں لے لیتا تھا۔ ہم کیسے اور کیوں پرستش
کرتے تھے ہمیں خبر نہ تھی مگر سادہ حسنِ حیات ہماری نماز تھی اور ہماری ہر
حرکت ارکانِ نماز۔ اس قدر صمیمی اس قدر شدید زندگی، وہ زندگی جو صرف زندہ
کے قدرتی لطف اٹھانے کے لئے ہو کیا پرستش کی پہلی شکل نہیں ہے؟ اس
زیادہ صحیح اس سے زیادہ طبعی پرستش کیا ہو سکتی ہے؟ اس خوب صورت
معبد میں ہر دن ہماری زندگی میں نئے عجائبات پیش کرتا تھا اور ہماری روح

ویران صنم خانے

بچپن! بچپن کا پرستش کدہ! جس کا گنبد نیل گوں تھا، تاروں کی
ں میں قندیلیں لٹکی ہوئی تھیں وہ قندیلیں جو ہماری تمناؤں کے ساتھ جھل
ل مل کرتی ہوئی اور ہماری طرف دیکھتی ہوئی جانی پہچانی آنکھیں بن کر لٹکتی
یں جس میں ہوا، ایک بازو میں اُمید، ایک بازو میں بیم لئے ہوئے ہم تک
ی تھی اور کسی کو بے آرام کرتی ہمیں تو لوریاں دیتی تھی۔

سرسبز مرغزاروں سے راگ، رنگین سمندروں سے سازہائے موسیقی
ں پرستش کدہ تک آتے تھے۔ معبدِ طفلی! ہم تمام پھولوں سے، درختوں سے،
یدانوں سے باتیں کرتے تھے، اور تمام جھینگر اور ٹڈے اور چھوٹے چھوٹے
ر ہمارے ساتھ شریک ہو کر اس پرستش گاہ میں پرستش کرتے تھے۔ اے
بدِ طفلی! تیری ایک بلیغ زبان تھی جو ہماری روح کے تمام جذبات اور
قلابات کی ترجمانی کرتی تھی۔ کسی معبد کا سنگِ در تجھ جیسا شفاف نہیں۔

تو رشید اُٹھ کے کسی کام کے بہانے سے بھاگ جائے گا؛ تھوڑی دیر کے بعد
بجاتا ہوا گاتا ہوا واپس آجائے گا لیکن آنکھیں سوجی ہوں گی، پپوٹے لال ہوں۔
یہ سب کچھ تو ہوگا، مگر اے دوست! اے وہ کہ جس کی نگاہِ لطف کے
میں ترستا ہوں، جس کا تبسم مجھے دنیا کی نعمتوں سے بڑھکر ہے، اے دوست
یہ تو بتاؤ، تم بھی میرے لئے دو آنسو بہاؤ گے کہ نہیں؟

پیٹھ پیچھے میرے متعلق سوال کیا گیا تو میری تعریف نہیں کی۔ مگر چپ رہا، جہاں میری تعریف کی جارہی تھی، وہاں بھی چپ رہا، جہاں میری برائی کی جارہی تھی، وہاں بھی چپ رہا۔ یہ محمود غیر متاثر نظر آنے کی کوشش کرے گا، لیکن اس کی آنکھ پرنم ہوگی۔

رشید جس نے آج تک مجھ سے نہیں کہا کہ میں تمہارا دوست ہوں، رشید لاابالیانہ ڈھنگ سے میرے پاس آتا ہے اور مجھے ستا کے، ہر بات میں میری مخالفت کرکے چلا جاتا ہے، جو میرے سامنے میری ذات کے متعلق کوئی بات نہیں کہتا، لیکن جہاں میں نہیں ہوتا ہوں، تو میرے لئے لوگوں سے یہ کہہ کے لڑتا ہے کہ "میں اس کا دوست نہیں، اور میں اسے اچھا نہیں سمجھتا، لیکن خوا مخوا کی بھی نہیں سن سکتا۔" رشید جو دوستی، رفاقت وصداقت کی ہنسی اڑاتا ہے، اور ہر جگہ کہتا پھرتا ہے کہ یہ بے معنی الفاظ ہیں جو احمقوں کے بہلانے کے لئے تراشے گئے ہیں، رشید میرے بعد پھوٹ پھوٹ کر روئے گا، پھر کہے گا کہ "یہ میرے دل کی کمزوری تھی، میں بے وقوف ہوں، میں عورت ہوگیا،" پھر خوب کھیلنے کی کوشش کرے گا، ہنسے گا، کھیلے گا، لیکن مہینوں کے بعد، برسوں کے بعد، جب کبھی کسی محفل طرب، کسی جلسۂ عیش میں میرا ذکر آجائے گا،

میرے بعد

دنیا کی خوشی میں، سعادت اور رفاہیت میں اضافہ نہیں ہوگا، مگر اندوہ و غم
میں کمی ہو جائیگی۔ ایک غم آگیں دل، ایک محبت آلود وجود دنیا سے اُٹھ جائے گا
سفالت و رذالت، اور تنعم و تعیش کی جنگ قائم رہے گی، مگر سفیل کے لئے
کڑھنے والا ایک دل غائب ہو جائے گا۔

میرے دوست احمد جو میرے پسینہ کی جگہ اپنا خون بہانے کے لئے طیار
ہیں، جن کے ادّعائے دوستی کی کوئی انتہا نہیں، جن کے اظہارِ لطف کے
احسان سے میری گردن دبی جاتی ہے، جن کے تبسمِ مدام، جن کے تلطیف
ناقابلِ التیام سے میری زندگی تلخ ہو رہی ہے، یہ میرے دوست احمد با
روئیں گے اور گھر میں جا کر قہقہہ ماریں گے۔

میرا دشمن محمود، میرا کھرا دشمن محمود، جس نے کبھی میرے پیچھے سے آکر مجھ
حملہ نہیں کیا، جس نے ہمیشہ مجھکو میرے منھ پر بُرا کہا، جس سے جب میری

بلکہ ابر نظر نہ آئے گا۔

اور اُس وقت آپ کو شاعر کا قول نہایت درست معلوم ہو گا :

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

بازاروں میں جائیے۔ دور تک سڑک کے دونوں طرف دوکانوں کے سامنے
پٹڑیوں پر قطار در قطار چھوٹی میزیں لگی ہوئی ہیں؛ گرد دو دو چار چار کرسیاں پڑی
ہیں میز پر سفید شفاف چادر بچھی ہوئی ہے۔ دلدادگانِ فیشن، ان پٹڑیوں پر لگی
ہوئی میزوں پر جاکر کھانا کھاتے ہیں خلقت جوق جوق گزر رہی ہے یہ اس عالم گزران
تماشا بھی کرتے ہیں اور کھانا بھی کھاتے ہیں اور حق تو یہ ہے کہ میں اپنے دل میں
انھیں قابل مواخذہ نہیں سمجھتا مصر کے اس صاف وشفاف نیلگوں چادر کے
نیچے، اس قدرتی مکوکب شامیانے کے تلے، رہنے کو (جس کی چھت میں
زمرد۔ اور ہیرے ایسی دلآویزی سے چمکتے ہیں؛ یوں کیوں نہ کہوں، ساکنانِ
ملاء اعلیٰ جہاں سے شرارت سے یوں ساکنانِ خطۂ خاک کی طرف آنکھ مارتے
ہیں) انسان کا دل اس طرح بے اختیار ہوکر بیٹھنے کو چاہتا ہے کہ مصر کی بناہائے محتشمہ
جن کے بنانے میں فراعنۂ قدیم اور مغرب سے آئے ہوئے فراعنۂ حال نے
اپنی ہمتیں صرف کی ہیں، اپنی طرف بلاتی رہ جاتی ہیں۔

آسمان، ہمارے ہندوستان کا بھی صاف ہے اور دل کش۔ مگر کم ایسا
ہوتا ہے کہ اس گنبدِ خضری میں کہیں سفید پلاسٹر سے مرمت نہ کی گئی ہو۔ آسمان مصر
اپنے پورے معنوں میں گنبدِ اخضری ہے آپ دوربین لگاکر بھی دیکھیں تو آپ کو

قبطی ہیں لیکن اکثر اور بیشتر مسلمانانِ مصر ہیں؛ یا کلمہ گویانِ شام! یہ ان لوگوں کا حال ہے جو اپنا پرانا قومی لباس پہنے نظر آتے ہیں۔

رہا نوجوان مصر، جو اپنے کپڑے پیرس سے سلوا کر منگواتا ہے، جو مراقِ فیشن میں انگریزی رنگیلے رسیلے فوجی لفٹنٹ سے بھی کئی منزل آگے نکل گیا ہے؛ نوجوان مصر، یا بقول خود ان کی اصطلاح کے،

"مصر الفتاۃ" اس کی نہ پوچھئے۔ ان کی زندگی عجیب زندگی ہے! اول تو دن بھر سیر سپاٹے میں بسر کرتے ہیں، اور شام کو گھر آتے ہیں؛ آرام لینے اور سونے کی غرض سے نہیں، کیوں کہ ان وظیفہ شناسانِ فرضِ عشرت کے قسمت میں گھر پر بیٹھنا اور آرام لینا کہاں ملتا ہے۔ انھیں تو گھر پہ کھانا بھی نصیب نہیں ہوتا؛ یہ صبح کے نکلے شام کو گھر آتے ہیں صرف کپڑے بدلنے کے لئے؛ پیرس کے کسی صنعت کار کے ہاتھ کا (جو درزی گری کو بھی شاعری اور مصوری کے ہمراہ فنونِ لطیفہ بھی شامل کئے جانے کا بجا مدعی ہے) سلا ہوا سوٹ پہنکر مصر الفتاۃ باہر نکلتا ہے۔ گھر میں خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ مگر وہ ہر شب گھر سے بھوکا ہی نکلتا ہے اور کسی رسٹاران (تناول خانہ) میں جا کر کھانا کھاتا ہے۔ رسٹاران میں، میں نے غلط کہا۔ رسٹاران کے باہر سڑک پر کھانا کھاتا ہے۔ قاہرہ کے فیشن ایبل

بوتل لاکر رکھی جاتی ہے اور وہ کاگ کھول کر ایک گلاس اس عرق کا جس
تیز بھبکا، آپ کی ناک سے گزر کر دماغ کو ٹکرا کر یہ کہتا ہے "میں شراب ناب
کچھ اور نہ سمجھئے گا۔" اپنے رفیق کوٹ پتلون والے کو دیتا ہے اور پھر ایک گلاس
اپنے لئے بھی بھر کر نہایت اطمینان سے تلچھٹ تک پی جاتا ہے! یہ دُرد آشام
سے حواس باختہ کر دیتا ہے۔ یہ جامۂ تقویٰ، یہ لباس مشروع اسلام اور علا
مصاحبتِ صراحی و جام! محتسب کہاں ہے؟ عسس کدھر ہے؟ مگر تھوڑی دیر
میں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ مسلم صورت، لیس بہ صورت مسلم ہے؛ یہ اور اس کے
اجداد اسلام سے اسی قدر دور رہے ہیں جس قدر ریورنڈ زویمر۔ حضرت نصرانی
ہیں؛ اور پکّے متعصب دشمنِ اسلام نصرانی۔ انھیں اس پہ فخر ہے کہ ہمارا خاندان
تیلوع اسلام سے پہلے عیسائی تھا اور اب تک عیسائی ہے۔ یہ قبطی ہیں نیلِ مبارک
اسلام نے تمام مصر کو سیراب کیا مگر قبطی بادیہ خشک ہی رہا اور اب تو اس بادیہ سے
جھکڑ چل رہے ہیں اس شدت کی بادِ سموم اٹھ رہی ہے کہ مصر کی مذہبی شادابی معرضِ خطر میں ہے۔
مگر اخفائے حقیقت کا مجرم ہونگا اگر میرے اس قدر لکھنے سے آپ کے دل پر
یہ اثر ہو کہ مصر کے ہوٹلوں میں اسلامی لباس پہنے جو لوگ جام بکف نظر آتے ہیں
وہ سب قبطی نصرانی ہیں؛ ہرگز یہ صحیح نہیں۔ وہ سب قبطی نہیں: ان میں سے بعض

تی ہے اور کہتے ہیں وہ۔ "نعم یاسیدی" ایک دفعہ آپ کو یہ خیال آتا ہے
آپ مصر میں ہیں۔ کھانا لایا جاتا ہے۔ طریقہ انگریزی ہے، لانے والے یورپین
ہیں، ان کے دماغ سے یہ واقعہ نکل سا جاتا ہے کہ آپ پارس میں یا روما میں نہیں
کہ اتنے میں عین آپ کے سامنے، مقابل کی کرسی پر، الف لیلہ کے
صفحات میں سے ایک تصویر نکل کر آ بیٹھتی ہے اور نہایت بے تکلفانہ اور
بے دھڑک طریقہ سے، مٹن چاپ کے لئے حکم دیتی ہے۔ وہی "الف لیلہ" کا عبا ہے
وہی ہارون رشید کے زمانہ کا قبا ہے، وہی عمامہ ہے اور جمالِ رخ روشن ہے وہی۔
ہاں! یہ مولوی صاحب اس صفائی سے بیٹھے ہوئے مٹن چاپ اُڑا رہے
ہیں، پاس والی میز پر دو اور حضرات، ایک قبائے عربیت میں، ایک درخت
زینت میں، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے آ کر بیٹھتے ہیں آپ دزدیدہ نظروں سے
ان کی طرف بھی دیکھتے ہیں اور اپنے دل ہی میں حیران ہوتے ہیں کہ یہ کون
ہیں۔ قبائے عربی آمرانہ لہجہ میں کھانے کو حکم دیتا ہے۔ غلمانِ جنت کے زمرہ کا
ایک غلام، ان کے لئے بھی کھانا لاتا ہے یہ منظر اب آپ کے لئے معمولی ہو گیا
ہے آپ کے سامنے پہلے ہی سے ایک مولوی صاحب بیٹھے ہوئے مٹن چاپ کھا رہی
رہے تھے، مگر یا ابو العجائب! یہ کیا؟ قبائے عربی کے سامنے گلاس اور

یا اٹالین ہیں، یا یونانی، یا ارمنی۔ حسین، سرخ و سپید رنگ کے اعلیٰ درجے
سیاہ کھانے کا سوٹ پہنے ہوئے نہایت صاف ستھرا کالر لگائے ہوئے
صاف شفاف قمیص جس کے کف اور فرنٹ (سامنے کا حصہ) روشن
ہیں چمک رہے ہیں زیب بر کئے آپ کی پذیرائی کے لئے کھڑے ہیں۔ یہ سب
صاحب لوگ ہیں۔ اس بات کو آپ ہرگز نہ بھولیے گا کہ اگر آپ کی ملاقات
کلکتہ میں، یا بمبئی میں ان میں سے کسی سے ہوگی تو یہ آپ سے بات بھی کرنا
ہتکِ عزت سمجھیں گے۔ ہندوستان پہنچکر ارمنی بھی اپنے تئیں فاتحانِ ہند
میں شمار کرنے لگتے ہیں اور یونانی بھی۔

آپ داخل ہوئے اور یہ غلامانِ پری تمثال دوڑ کر آئے اور آپ کو
گھیر لیا: ایک کہتا ہے "اھلاً وسھلاً" ایک کہتا ہے "تفضل" ایک
آپ کا اوورکوٹ اتارنے میں مدد دیتا ہے، ایک نہایت ادب سے آپ کے
ہاتھ سے چھڑی لیتا ہے، ایک میز کے پاس ایک کرسی کو آپ کے لئے گھسیٹتا ہے
اور فوراً کھانے کی فہرست آپ کے سامنے لا کر پیش کرتا ہے۔ آپ نے کھانا انتخاب
کر کے لتے لانے کو کہا۔ وہ آپ سے استفسار کے طور پر پوچھتا ہے "نعم
یاسیدی؟" آپ چونک اٹھتے ہیں۔ ان لبوں سے "یس سر" کی توقع

دوسرے کو نہیں، ایک دوسرے کے ساتھ کھاتا ہے. سیاسی اور پولیٹیکل سب وشتم
مصر میں بھی ایک فنِ لطیف ہوگیا ہے؛ مگر دونوں جانب کے اُستادانِ فن،
عربی ہی میں اپنا کمال دکھاتے ہیں؛ اور میرے خیال میں دادطلبی کے لئے
یہ لازم بھی ہے، شاعر کہتا ہے۔

سرِ بزم وہ گالیاں دے رہے ہیں
مزا لینے والے مزا لے رہے ہیں

ہم نے فرض کیا کہ سرِ بزم وہ گالیاں دے رہے ہیں اور یہ بے حد
باعثِ مسرت ہے لیکن مزا لینے والے تو مزا اسی وقت لے سکتے ہیں جب وہ ان
گالیوں کو سمجھیں۔ یہاں یہ کوشش ہے کہ گالیاں تو ضرور دی جائیں بغیر اس کے
زندگی ایک بارِ گراں ہو جائے گی مگر ہم ہندی میں گالیاں دیں گے تم اُردو
میں اور یہی نہیں بلکہ ہمارا اور تمھارا ہر چیز میں تیل پانی کا ساتھ ہوتا ظاہر
کیا جائے ہم دھوتی پہنیں گے تم پاجامہ پہنو اور ہاں دیکھنا کہیں کھانا ایک جگہ
نہ ہو۔ تنہا خوری الی الابد تنہا خوری!

مصر میں دوسرا ہی منظر پیشِ نظر ہوتا ہے؛ مصر میں کیا ان تمام ممالک میں
ایک ہوٹل میں آپ کھانا کھانے کے لئے تشریف لے جاتے ہیں۔ تمام خدام

کھانے کا وقت تھا اور میں بھوکا بھی تھا۔ ایک کھانے کے ہوٹل میں
یہاں کی اصطلاح میں لوقنطہ میں۔ میں بھی جا بیٹھا۔ میں جب کبھی ہندوستان سے
باہر آیا، ہندوستان کی ایک خصوصیت کا خیال بہت شدت کے ساتھ دماغ
میں آیا۔ مصر بہت سی باتوں میں ہندوستان سے مشابہ ہے۔ موسم ملتا جلتا
ہے، پیداوار قریب قریب یکساں ہے۔

باشندوں میں اختلافِ مذہب بھی ہندوستان کی طرح شدید ہے۔ نئی اور
پرانی تہذیبیں دونوں یہاں بھی ہندوستان کی طرح جلوہ گر ہیں۔ ہندوستان
کے مانند یہاں بھی طرزِ قدیم اپنی ہستی قائم رکھنے کے لئے مدافعانہ گو مذبوحانہ
کوشش میں مصروف ہے اور طرزِ جدید حملہ کناں ہے۔ سیاسیات میں ہندوستان
کے ہندو اور مسلمانوں کے مخاصمانہ تعلقات کا چربہ مصر میں قبطی اور مسلمانوں
کے تعلقات نے کچھ بڑھ چڑھ کر ہی اتارا ہے۔ یہ سب کچھ ہے مگر طرزِ معاشرت
میں وہ یکسانیت ہے جسے آنکھیں ہندوستان میں حسرت سے ڈھونڈھتی
ہیں اور نہیں پاتیں، یکسانیت ہی نہیں اشتراک بھی ہے۔ اخبارات کو دیکھئے
تو آپ کو یہ خیال ہوگا کہ قبطی اور مسلمان ایک دوسرے کو کھا جائیں گے، مگر
ہوٹلوں میں، تناول خانوں میں اور گھروں میں جائیے تو دیکھئے گا کہ ایک

لکھنؤ چلی گئیں) اپنے شاگردوں کو اپنا اور قدیم اُستادوں کا کلام سنا کر طلبہ میں
ذاقِ سخن پیدا کرتے تھے۔ بازار مصر میں (آپ یہ نہ خیال فرمائیں کہ میں بار بار
مصر کا بازار قاہرہ کی بجائے صرف ایک لفظی رعایت کی وجہ سے کہتا ہوں،
اہلِ مصر شہر قاہرہ کو مصر کہتے ہیں) نکلتے ہی ایک مصرعہ میری زبان پر
بے ساختہ آ گیا: ؎

ڈانڈا ملا دیا ہی حبش سے تتار کا

ذہن میں یہ بھی یاد آ گیا کہ یہ مصرعہ مولانا شبلی کی زبان سے سنا تھا۔ مصرعہ تھا
یا پورا شعر، جو انھوں نے فرمایا تھا یاد نہیں، مگر میں اسے بار بار دہراتا رہا۔
یہاں کی حالت پر وہ بلفظہ صادق آ رہا تھا۔ ہمارے شعرا کی سحر و شام کا اجتماع
جیسا میں نے یہاں دیکھا اور کہیں نظر آیا۔ جس قہوہ خانہ میں گھس جائیے،
جس ٹرام وے پر سوار ہو جیے، ایک حبشی زادۂ شب رنگ کے پہلو میں اک
ترکِ سمن بر بیٹھا ہوا ہی۔ شبِ دیجور اور صبحِ صادق ایک ہی میز پر کھانا
کھا رہی ہیں یا چائے پی رہی ہیں۔ معلوم ہوتا ہی ابھی تہذیب میں مصر نے
بالکل ترقی نہیں کی، ٹرانسوال سے اور ہندوستان کی ریلوے کمپنیوں سے
چند درس گویانِ مدنیت وہاں بھیجنے چاہئیں۔

زیارتِ قاہرہ

(سنہ ۱۹۱۱ء)

محبت۔ وہ پری جس کے عالمِ شمول بازوؤں کے سائے کے نیچے میں بھی
زندگی بسر کرتا ہوں بستکر ہی مجھے قاہرہ تک توے آئی۔ اس کی تفصیل اب
آپ نہ سنئے کہ آیا میں سینہ پرسکون لے کر آیا تھا، اور متہیج لے کر نکلا یا متہیج
لے کر آیا تھا اور پرسکون لے کر نکلا۔ بازارِ مصر میں تنہا میں ہی اک پُرشوق
مگر بے مایہ خریدار نہیں آیا ہوں۔ اک سوت کی انٹی والی مجھ سے پہلے بھی گزر چکی
ہے۔ بازار میں برقی روشنی ہو رہی تھی، اور ازبکیہ (یہ اس حصۂ شہر کا نام ہے
جہاں میں ٹھیرا تھا) ایک بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ وہ ادیبِ شہیر و استادِ محترم،
شبلی جس کے سامنے زانوے ادب تہ کرنے کا مجھے بھی فخر حاصل ہے، اپنی
علمی صحبتوں میں زجوان کے سامنے ہی علی گڑھ سے خدا جانے کہاں شاید

اور یہاں، اس حرمِ محترم کے سامنے، اس لمحے میں، میرے قلب کا شعلۂ علویت جو دبا پڑا تھا، نہایت تیزی سے بھڑک اُٹھا، میری آنکھیں پُرنم تھیں اور قلب پُر رقت! الحمدللہ الحمدللہ میری معنویات تپائی جا رہی تھیں، اور کھوٹ ان میں سے نکالا جا رہا تھا۔ اور اس وقت مجھے اک دوسرے منادی کا قول یاد آیا:۔

عزیزو حق کی رحمت ہے یہ پیرِ ناتواں ہم میں   پھر ایسا پیر ہے ہم میں نہ کوئی نوجواں ہم میں
ہزاروں ہونگے ہم میں بجلیر اور ماسٹر پیدا   مگر اے قوم ایسی صورتیں پیدا کہاں ہم میں

بعد فاتحہ، یہ مجمع منتشر ہو گیا اور ہم سب واپس چلے آئے۔

مگر مجھے اک اور اعتراف کرنا ہے:۔

میں بت پرست ہوں رکھدی کہیں جبیں میں نے

ختم ہوا، اور معانقوں اور قہقہوں اور فقروں کی گرم بازاری پھر شروع ہوئی،
مگر سب اب مسجد کی طرف جارہے تھے۔
اُس کی قبر کے گرد سب جمع ہوئے۔ میں پھر پہلی صف میں نہ تھا؛ دور تھا۔
فاتحہ کے لئے سب نے ہاتھ اُٹھائے؛ اور اُس کے بعد اس حریمِ صداقت؛
اس مدفنِ بے ریائی وحق گوئی سے ایک آواز آنی شروع ہوئی۔ کیسی آواز!
یہ اُس کی تو نہ تھی جو بے ریا خدمتِ خلق، نڈر سچّائی کو اپنے ساتھ دفن کئے ہوئے
ہے۔ وہ آواز میری سُنی ہوئی تھی۔ وہ اعماقِ کوہ سے نکلنے والی، ابرِ تیرہ سے
کڑکنے والی رعد سے مشابہ ہوا کرتی تھی۔ ہم اکثر اس کے سامنے کانپتے ہیں۔
یہ آواز آتی تو اسی کی خواب گاہ سے تھی، مگر یہ اُس کی آواز نہ تھی۔ ایسا
معلوم ہوتا تھا کہ اک فرشتہ[1] آسمان سے اُتر کر، اس کھلی چھت سے جو شاید
اسی لئے کھلی رکھی گئی ہے، داخل ہو کر اس کے بالین سے، منادیٔ غیب
کی طرح حقائقِ آسمانی، اپنی شیریں اور باریک آواز سے بیان کر رہا ہے؛
ایک عجیب اہتزاز سے اس منادی کی آواز مجھ تک پہنچی:-

"جَاۤءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا"

---

[1] ایک خوش الحان لڑکے نے قرآن مجید کا ایک رکوع تلاوت کیا تھا۔

کس گرم جوشی سے ہم ملے۔ چہرے بدلے ہوئے تھے۔ بعضوں کے چہروں پر داڑھیاں تھیں، مونچھیں سب کی آسمان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ معانقہ ہوا۔ اور اُس نے بتایا کہ چہرے بدلے ہوئے تو تھے ہی، ہائے ستم! قلب بھی بدل گئے تھے۔ معانقہ پر دل کی تڑپ ویسی بیتابانہ نہ تھی، اگرچہ معانقہ میں ایک دوسرے کو بھینچنے کی ادا، ضرورت سے زیادہ جوش بھری تھی، دل کی دھڑکن اپنی معمولی رفتار میں تھی۔ ہائے صداقت تو کہاں ہے؟

مدمقابل میں میرا دل تھا، کیا میں ایمان داری سے کہہ سکتا ہوں کہ میرے دل کی پرستش میں کچھ فرق آیا تھا؟ بہت کم۔ اس طرح یہ دن گزرا اور جس محیط سے میں نکل کر آیا، اُس میں اور اس میں مجھے بہت کچھ فرق معلوم نہیں ہوتا تھا۔

دوسرے دن صبح کو اسٹریچی ہال میں سرسید کی برسی کا جلسہ تھا۔ میں پہنچا تو جلسہ شروع ہو چکا تھا۔ اسپیچوں کی گرم بازاری تھی۔ ایک صاحب اُٹھتے تھے، اسٹیج پر آکر ہاتھ ہلاتے تھے (میں بہت دور تھا) پاؤں کو بھی کبھی کبھی جنبش دیتے تھے۔ بیٹھ جاتے تھے، دوسرے صاحب اُٹھتے تھے۔ مجھے یہ کٹھ پتلیوں کا تماشا معلوم ہوتا تھا، جلسہ نہایت خنکی اور برودت سے

احساس ہو رہا ہے۔ یہ ملوث محیط جس میں میں پڑ رہا ہوں، زیادہ کثیف زیادہ
غلیظ ہوتا جا رہا ہے۔ واعظ کا وعظ، نقیب کی ہیجان انگیز صدا، میرے پاس سے
اثر ڈالے بغیر گزر جاتے ہیں۔ واعظ کے کپڑوں کو دیکھتا ہوں اور ہنستا ہوں،
نقیب کی ہیجان انگیز صدا کو بناوٹی سمجھتا ہوں، اسی زمانہ میں بہت سی خبریں
قلب ملت کو متہیج کرتی ہیں۔ میں یہ تو نہ کہوں گا کہ ان سے متاثر نہیں ہوا۔
مگر ہاں اتنا متاثر نہیں ہوا جتنا میں دیکھتا تھا کہ بعض اور لوگ ہوتے تھے۔

اپریل کی پانچویں تھی، میں شب کو اسی ہوائے کثیف انانیت کو پھیپھڑے
میں کھینچتا ہوا ریل میں سوار ہوا اور صبح کو علی گڑھ پہنچا۔ اچھی جگہ تھی مجمعِ
احباب تھا۔ پرانی صورتیں نظر آئیں؛ سب چہرے داڑھیاں لگائے ہوئے
تھے۔ بشاش، فرح ناک؛ خود کامگار۔ ان کا طالع ان کا یار۔ زندگی سے
متلذذ۔ یہ وہ لوگ تھے کہ اپنے اور سب کی توقع سے کہیں زیادہ زندگی میں
کامیاب ہوئے۔ علی گڑھ ان کے لئے کشادہ آغوش رہتا ہے مگر وہ دوسرے؟
جنھیں دنیا نے اپنا چہرہ متبسم نہیں دکھایا، بلکہ جنھیں لطمۂ حیات متواتر دنیا کے
چہرۂ خشمگین ہی کی زیارت کراتا ہے۔ وہ کہاں ہیں؟ ہائے وہ علی گڑھ نہیں آتے
وہ ہم ظاہر پرست یارانِ قدیم میں کوئی کشش نہیں پاتے۔

سیّد کی قبر پر

مجھے اعتراف کرنا ہے: حرصِ جاہ و مال و ہوسِ نفس سے مغلوب ہو کر وہ شعلہ جو مجھ میں کبھی - اور یہ زندگی کے علوی لمحے ہوتے ہیں - تیزی سے بھڑکتا ہے افسوس کہ اکثر - اور جس زمین سے ہم مربوط ہیں اس میں زندگی بھی بیشتر سفلی ہی ہے - بہت دھیما رہتا ہے، گو شکر ہے کہ بجھتا نہیں - اور خدا کرے کہ جس دن یہ شعلۂ قلب، میری بے حمیتی سے بجھے اس دن بلکہ اسی لحظہ یہ شمعِ حیات بھی گل ہو جائے۔

حرصِ جاہ و مال و ہوسِ نفس! بس حرص و ہوس۔ نہ یہ نصیب، نہ اُس کے پورا کرنے کا اقتدار۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

یہ شعلہ، یہ لاہوتی نور، مجھے چھوڑے جا رہا ہے - مجھے خود اس کا

وہاں بھی مجھے سجدہ کرنے دے، اور مجھے اپنے قیدیوں میں لے لے

نینداس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
جس کے شانوں پر تری زلفیں پریشاں ہوگئیں

نظروں کی ایک شعاع جو اتفاقاً مجھ پر پڑ جاتی ہے، مجھے غرقِ حرارت کر دیتی ہے:
میری روح کی بے تابانہ انجذاب میں ایک اسیرانہ توکل ہے۔

تو میرے لئے اتنی دُور ہے۔ اتنی اونچی ہے، کہ کلیوپیٹرا کی طرح دُور ہے،
اونچی ہے۔ اتنی اونچی ہے کہ میری اُمیدیں بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتیں؛
تجھ تک اُن کی رسائی نہیں۔

اس چکور کی مانند جو چاند کے نور اور چمک پر عاشق ہو کر اس تک پہنچنے
کے لئے اپنے بے طاقت بازو پھڑپھڑا کے زمین پر گر پڑتی ہے، میری نظریں
بھی اس اشتیاق میں اُٹھتی ہیں کہ تیری ایک نظر سے ملیں گی، گو وہ بیگانہ ہی ہو؛
ایک مسکراہٹ کو دیکھیں گی، گو وہ کسی دوسرے کے لئے ہی ہونٹوں پر
آئی ہو، تری نظر کے ایک تارِ نور سے گرم ہوں گی، گو وہ گریزاں ہی ہو؛
وہ تجھ تک جاتی ہیں اور صرف اُن بالوں میں، جو مصر کی نازوانداز سے
بھری ملکہ کے تاج کی یاد دلاتے ہیں، پھنس کے رہ جاتی ہیں۔

وہ قیدی، اس سر کے ساتھ ایک جگہ رات گزارنے کے لئے جس پر
وہ تاج رکھا جاتا تھا اپنی جانیں دے دیتے تھے۔

آ، تو بھی میری کلیوپیٹرا ہے۔ جس تکیہ پر یہ بال پریشان ہوتے ہیں،

کلیوپیڑا

(دھلی کی ایک ملاقات کی یاد)

کلیوپیڑا، مصرِ قدیم کی وہ پرناز و محتشم ملکہ، جس رات بہت مغلوب ملال ہوتی، تو اپنا دل بہلانے کے لئے، اپنے مشتاق اور عاشق قیدیوں میں سے ایک کو بُلا کر، اپنے تمام لطفوں کے ساتھ (جو عورت ہی دے سکتی ہے، اور وہ اس طرح کہ احمق مرد پر ظاہر کرے کہ وہ اسے چاہتی ہے) اُسے مست و مدہوش کرتی، اور پھر، گویا وہ جانتی تھی کہ ایسی مزیدار رات کے بعد اُس قیدی کو اُس سے جدا ہو کر زندہ رہنا کیسا مشکل ہوگا۔ اپنے ہاتھ سے یہ کہکر "میری خاطر، خوشی خوشی پیوگے نا ؟" زہر کا پیالا پلا دیتی۔

آ، میں بھی تیرا قیدی ہو جاؤں، اے دلبر! تجھے بھڑک دار فٹنوں میں، موٹر کاروں میں نازو انداز سے بیٹھے دیکھکر تیری بیگانہ

دیکھ رہی ہے، اس کی شوخ چمکدار آنکھوں میں کچھ رحم، ذرا
امان نہیں۔

اُف! چھوڑ دے، اے بچے چھوڑ دے، میں تجھ سے کہتا ہوں۔ وہ آج
ہی کی صبح، آج ہی صبح، پوشش سحر، اور لرزش حریر سے پیدا ہوئی تھی۔
اُس نے آج صبح ہی سے زندگی شروع کی ہے۔ اُس نے ابھی ہی تو
اڑنا شروع کیا تھا۔

چھوڑ دے، ارے چھوڑ دے، میں تجھ سے کہتا ہوں۔ وہ بھی بالکل
تیری ہی طرح ہے۔ وہ بھی تیری ہی طرح کھلنڈری ہو کر جینا چاہتی ہے۔
دیکھ ابھی اس پھول تک تو وہ پہنچی ہی نہیں۔ چھوڑ دے، چھوڑ دے، اُف
چھوڑ دے۔

بچہ، فاتحانہ اور مظفرانہ طریقہ سے دوڑ کے آتا ہے، اور ہنستا اور
اچھلتا اور کودتا ہوا، اپنا ہاتھ بڑھا کے ہتھیلی کھول دیتا ہے۔ اس کی گلرنگ
ہتھیلی میں سے اک خاک گرتی ہے۔ ایک باریک زریں اور خوشبودار خاک۔

اب کہئے کہ۔

تیتری اک غبارِ رنگین ہے۔

اُف کیا ہی حسین منظر ہے جسُن، حسُن کا تعاقب کر رہا ہے۔ اُس کے سنبل کے سے بال جو ہوا میں لہرا رہے ہیں، پسینے میں تر ہو جاتے ہیں۔ گال گرم ہو جاتے ہیں، سُرخ ہو جاتے ہیں، سانس اکھڑ جاتا ہے۔ اب وہ تھک گیا ہے، گرتا پڑتا بھاگتا ہے۔ اُف! تیتری اُس کے ہاتھ نہیں آتی۔ ماں چلا چلا کے کہہ رہی ہے: "بیٹے دوڑ مت گر پڑے گا" تیتری، یا دوسرے الفاظ میں وہ پریشان، بے تواں، لرزاں پر، ادھر سے اُدھر بے محابا اُڑ رہی ہے۔ اب پھر کوئی مثال دیجئے اور کہئے کہ تیتری ایک نور ہے، پاشیدہ، آخرکار بے طاقت ہو کر، وہ ایک پھول پر گر پڑتی ہے۔ اور اُسے ایک مذبوحانہ غیرت اور شدت سے لپٹ کے چوسنے لگتی ہے۔ اب یوں کہئے کہ تیتری ایک ہونٹ ہے کہ بوسہ لینے کے لئے پیدا ہوا ہے، ایک نفس ہے کہ سونگھنے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ عشق ہے کہ لپٹنے کیلئے پیدا ہوا ہے، اس قدر حریص ہے۔

بچہ، خوشی کی آواز سے چلاتا ہے: "اماں، پکڑ لی"، اور خوشی کے مارے اپنے لرزتے ہوئے، ہاتھ بڑھا کے دکھاتا ہے۔ لیکن۔ الٰہی پناہ! اُس رعشہ ناک، ننھی سی جان کے لئے جو بچے کو نومیدانہ نگاہ سے

سب سے زیادہ روح پرور رنگوں سے مرکب اک شہپر ہے جس میں لرزشِ حیات پیدا ہوگئی ہے، یا اک نورِ سیّال ہے جسے پریوں نے چھو کر قطرے میں تبدیل کر دیا ہے۔ یا یوں کہئے کہ تیتری اک نسیم ہے کہ چلتی ہے، اک نفس ہے کہ آہ کر رہا ہے۔ ایک قطرہ ہے جس میں تلاطم پیدا ہو گیا ہے! اک خندہ ہے کہ ہونٹ پر جم گیا! اک تبسم ہے کہ ریزاں ہے اور سب سے بہتر یوں کہئے کہ تیتری اک سودا ہے بے قرار، اک نسیم ہے، معنبر، ایک بوسہ ہے ذی روح اک شعر ہے، رقصاں۔
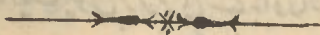
گھنگریالے بالوں والا، گلابی گالوں والا، شوخ چمکیلی آنکھوں والا ایک پیارا پیارا بچہ، اک طرف کو نظر گاڑے دیکھ رہا تھا کہ ہماری تیتری اُسی نظر پڑی۔ اک دم اُس کی نظروں میں ایک شعلۂ حرص بھڑک اٹھا، مُنھ کھُل گیا، آنکھ اس پر جم گئی، چہرہ شوق سے سرُخ ہو گیا! اُس نے اپنے بازو اس اڑتی تیتری کو پکڑنے کے لئے بڑھائے، اور چلّا کے کہنے لگا: "اماں! اماں تیتری" وہ شوق کی ہنسی سے ہنستا ہے اُچھلتا ہے، اُس کے ہونٹ شدّتِ اشتیاق سے کانپ رہے ہیں اور وہ تیتری کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔

جھجکتی ہوئی کانپتی ہوئی، اُس پُرنور کف کی طرح، جو موج سے علیحدہ ہو گیا ہو
ہوا میں معلّق لرزتی ہے۔ لیکن پھر تھوڑی دیر میں اُڑنا شروع کر دیتی ہے اور
اُس غنچے کے پاس جاتی ہے جو اپنے تنگ قبا میں سے نکلنے کی کوشش
کر رہا ہے، اور قبا کی تنگی کی وجہ سے ہوا میں فریاد کر رہا ہے اور بیہوش ہو جاتا
ہے۔ مزے لے لے کر وہ اُن اوراقِ گُل کے گرد چکر لگاتی ہے جن پر قطرۂ شبنم
پڑے ہیں جو نیچر کے گویا اشکِ پرستش ہیں؛ وہ چکر لگاتی ہے اور پھر بیٹھ جاتی
ہے۔ اُف! وہ بہت بدمعاش ہے۔ اُس کی محبت ایک بوسے ہی پر ختم
ہو جاتی ہے۔ بوسہ لیتی ہے اور چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ وہ بہت ہرجائی
ہے، وہ بہت سیلانی ہے، وہ کسی کی ہو کے نہ رہیگی۔

اُس وقت غنچہ ایک آہِ حرمان کے ساتھ اپنا سینہ اُبھارتا ہے، اور
شاخ پر ہل ہل کر، گویا لمبی، حزیں اور عاشقانہ، نمناک نگاہِ ابتلا سے اُسے
دیکھتا ہے۔
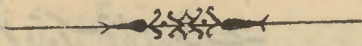
یوں کہئے کہ تیتری مخموریتِ عاشقانہ کی حالت میں پری بہار کے جسم سے
نکلی ہوئی ایک خوشبو ہے جس نے شکل اختیار کر لی ہے۔ یا وہ نیچر کے

مرغ کی بانگیں کچھ غلغلہ ڈال دیتی ہیں، ہر چیز میں ایک لرزشِ حیات پیدا ہوتی ہے، کائنات خوشی کے آہنگ کے اوپر محظوظانہ رقص کرتی ہے کہ اتنے میں کرۂ آفتاب، آنکھوں کو خیرہ کرنے والی چمک دار ہیبت کیسا تھ افق میں پہاڑ کی چوٹی پر سے نمودار ہوتا ہے۔

ایسے وقت میں، اس طرح جیسے نسیم نے ہلکا سا جھونکا لیا، نہ معلوم کہاں سے تیتری پیدا ہوتی ہے۔ آفتاب اپنے زرّیں تلاطم سے ہر چیز کو غرق کر رہا ہوتا ہی، یہ تیتری اُس نور کے دریا میں اپنے آب گوں بازؤں کی ساتھ بحرِ ذوق اور پرنشہ حریر کی پشواز پہنے ناچنا شروع کرتی ہے۔

اب، اُس نازک غنچے کو جو چھپ چھپ کے ہنس رہا ہے، لرزتی ہوئی جاتی ہے اور چھونا چاہتی ہے، اس کے چاروں طرف جو نور کی بارش ہو رہی ہے، اس میں خوش اور مستانہ وار جھوم جھوم کے پیراکی کرتی ہے؛ اور وہ نور بھی اُسے اپنے آغوشِ پرستش میں لیتا ہے۔

اب شاید آفتاب کی حدت سے کچھ تھک جاتی ہے یا کیا۔ کہ اُس کی زرّیں پروں کی حرکتوں میں کچھ سُستی آتی ہے: اور وہ پروں کو سمیٹ کے

تیتری

تمام کائنات کی آنکھوں میں اس طرح جیسے وہ ایک گہری نیند سے بیدار ہوتی ہو، سکونِ مطلق میں کچھ جنبش پیدا ہوتی ہے۔ آفتاب، پری سحر کے رخساروں کو ایک محبت بھرا بوسہ لے کر دمکا دیتا ہے۔

وہ پُرآب نگاہِ اشتیاق یعنی زہرہ، آسمان کے گلرنگ چہرے میں سے، پہاڑ کی چوٹی کے پیچھے سے مخمور و سرمست پڑی ناچتی ہے، چمکتی دمکتی ہے۔ ساحل میں ایک گہری اور لبھانے والی خوش بو پھیلی ہوئی ہوتی ہے۔ درختوں کی جھالروں میں سے، مُسکراتی ہوئی روشنیاں کھیلتی ہوئی نظر آتی ہیں، دل ربا آوازیں سُنائی دیتی ہیں۔

تمام نیچر پر پڑی ہوئی وہ رات کی رقیق، گیلی چادر رنگین ہو جاتی ہے: شبنم چمک اُٹھتی ہے۔ ہوا کے سُست سُست جھونکے اِدھر سے اُدھر اِس طرح چلتے ہیں گویا دن جاگ کر جمائیاں لے رہا ہے۔ اُس منتشر خوشی میں کبھی کبھی

نشے کو بھی ساتھ لے جا، جو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی محترص بغل گیری سے حاصل ہوا ہے۔

اتنی دور جا کہ تیری آواز کو، تیرے گانے کو نہ سُن سکوں، تجھے نہ دیکھ سکوں۔ اور تو بھی اے موسیقی؟ آہ، اے موسیقی، تو بھی چپ ہو جا۔ وہ غزل نہ گا، وہ راگ نہ گا، جو مجھے زندگی کی سب سے بہتر، اگ راگ کی یاد دلاتا ہے۔ اُن حرارتوں کو، ان شعروں کو جو میری روح میں مستور ہیں بحران و ہیجان نہ دے۔

کیوں کہ میں خود اپنے سے، اپنی طاقتِ تحمّل سے شبہ کرنے لگا ہوں، کیونکہ میں ڈرنے لگا ہوں کہ میں اس عورت کے لئے سب کچھ کر گزروں گا۔ میں ڈرتا ہوں کہ میں اپنی متانت کھو بیٹھوں گا، اپنی سلامتی، اپنی انسانیت جسے میں اب تک قائم رکھ سکا ہوں، ہاتھ سے دے بیٹھوں گا۔

چپ رہ، میں کانپ رہا ہوں، دیکھ میں مرا جا رہا ہوں۔

دے کر تجھ تک پہنچتے ہیں، اُن کے لئے تیرے نشے کس قدر بارد، تیرا اظہارِ شوق کس قدر جھوٹا، اور تیرا گلے ملنا کس قدر پُر استکراہ، تیرے بوسے کس قدر تھکے اور سُست ہیں۔

یہ جانتا ہوں، مگر پھر وہی! یہ آنکھیں، یہ سیاہ آتش سے بھڑکنے والی سیاہ آنکھیں، اور اُن کی متلاشی ظلمتیں جو متجسس معلوم ہوتی ہیں، یہ خانماں سوز متانت ہیں۔ اُن کی تپش میں جب میں اپنے تئیں پاتا ہوں، تو میں بھی یہ چاہنے لگتا ہوں کہ چاہے جو کچھ ہو، میں بھی ان آنکھوں کی ظلمتوں میں ڈوب جاؤں، میں بھی اس آتش سے اپنے تئیں جلا لوں، ایک رات تو اُن آنکھوں سے سرمستِ آلام ہوں۔ اور اگر تو کہیں اصلی محبت کرے، اُف! کہیں تو اک ذرا چاہے، اُس وقت، دیکھتی ہو، اس وقت کو سوچ کے اور اپنے پر نظر ڈال کے، اپنی روح کو دیکھ کے، میں اسی طرح ڈرنے لگتا ہوں جس طرح اک پُر طوفان رات کی پُر شور تاریکی سے کوئی ڈرے۔

نہیں، نہیں، جا، جا، میں نہیں چاہتا، اور اپنے ساتھ اپنی اُس آواز کو بھی لے جا جو میری روح کو زیر و زبر کر رہی ہے اور اس تھکی ہوئے

آہ! یہ نظریں

تھکی ہوئی، تمام شب ہائے عشق کی بقیہ مسرتِ مخمور سے تھکی ہوئی نظریں، تیری آنکھوں سے جو سرمست و شیدا و پُرلطف دقیقے دینے کے وعدے کرتی ہیں، ان آنکھوں سے نکلنے والی ہلکی نظریں!

ان سیاہ آنکھوں کی سوزاں ظلمتوں میں، ایک ایسا مبہم اشارۂ دعوت پاتا ہوں کہ میری روح ان نیوتوں کو دیکھ کے حرص سے لرزنے لگتی ہے۔

جب تک کہ تیرا لطف خریدا جاتا ہے، تو چاہے جتنی اونچی ہو، جتنی چاہے اونچی بن، عسیر الحصول نظر آ، میں بھی اک پوری رات، اک لمبی رات، تیرے یاسمینی سینے میں گزارنا چاہتا تھا، مگر میرے شوق، میری آتشِ اشتیاق کو جو بنیر اکل وجود و روح چاہتی ہے، تیری بے حجابی تیری بے حرارتی، تیری بے محبتی زائل کر دیتی ہے؛ بجھا دیتی ہے۔

تیرے چاہنے والے جو تیرے دل تک ذرا نہیں پہنچ سکتے، جو پیسہ

تب تو ایک نگاہِ غلط انداز لطف سے شاد کام نہ کیا، پس اب بھی یہی چاہتا ہوں کہ کبھی شاد کام نہ ہوں، آہ! اسی طرح مہجور، مقہور، اسی طرح وطن سے دور، اسی طرح مشتاق، اسی طرح حسرت کشِ سوزش ہائے نہانی مرجاؤں ۰۰۰۰۰۰۰

میں چاہتا ہوں کہ جس طرح صبح سویرے نور کے تڑکے باغ میں چھوٹی چڑیاں ایک شاخِ گل سے دوسری شاخِ گل تک اڑتی پھرتی ہیں، اور گلاب کی پنکھڑیوں پر سے شبنم کے قطروں کو گرا دیتی ہیں، اور نہیں سمجھتیں کہ کیا ظلم کیا، اسی طرح تم بھی کبھی نہ سمجھو، نہ میرے جینے کی، تمہارے لئے جینے کی، نہ میرے مرنے کی، تمہارے لئے مرنے کی، تمہاری چاہ میں مرنے کی، تمہیں خبر ہو تم مجھے نہ دیکھو، شاید۔۔ ۔۔آہ! شاید میرے مرنے کے بعد قبر پر۔۔ ۔ مگر میں اسے بھی نہیں چاہتا، میں اس کا بھی قائل نہیں۔

میں چاہتا ہوں، چاہتا ہوں کہ تم اسی طرح مجھے کبھی نہ جانو، نہ پہچانو، اپنا تغافل قائم رکھو، اور میں تلخکام، زہرناک ہجر میں زندگی بسر کروں، ہجر میں زخم کھا کھاکے، رو رو کے، تڑپ تڑپ کے مرجاؤں، داغوں کی سوزش سے جل جاؤں۔

میں چاہتا ہوں کہ

چاہتا... آہ چاہتا ہوں کہ تم اسی طرح مجھے نہ پہچانو، نہ جانو، اپنا تغافل قائم رکھو، اور میں تلخ کام زہرناک ہجر میں زندگی بسر کروں۔ ہجر میں زخم کھا کھا کے، رو رو کے، تڑپ تڑپ کے مرجاؤں، داغوں کی سوزش سے جل جاؤں۔

اور تمھیں خبر نہ ہو کہ میں نے تمھارے لئے جان دے دی، تمھاری برقِ نگاہ کے خیال میں جل کر راکھ ہو گیا، تمھیں خبر نہ ہو کہ اک پژمردہ دل تمھارا خیال کر کر کے، تمھاری یاد کر کر کے، اپنی تمام جوانی، اپنی تمام عمر کاٹ رہا ہے۔ اُس کی تمنّائیں، امیدیں، حسرتیں تمھارے لئے ہیں، وہ تمھاری خاطر غم زدہ زندگی بسر کرنا اور تمھاری خاطر غمزدہ موت مرنا چاہتا ہے، وہ بیچارہ دل بس یہی، صرف یہی چاہتا ہی!

جب پروانہ کی طرح یا سایہ کی طرح رات دن میں تمھارے پاس تھا،

بادلوں کی رنگ آمیزیوں میں، خاموش رات کو موجوں کی فشافش میں
حزنِ قمر، خندۂ صبح میں ڈھونڈتی پھرا کریں.

آہ! مت ٹھیر، گائے جا، اللہ کے واسطے گائے جا، ستار کے ساتھ
میرے دل کے ساتھ، گائے جا، یہ عرض وہ ہے جو میری روح تیری
روح سے کرتی ہے. آہ! میں التجا کرتا ہوں، گائے جا!
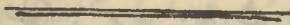
باریک آواز سے گائے جا، ستار کے ساتھ چنگ و رباب کے ساتھ میرے دل کے ساتھ گائے جا۔ یہ وہ التجا ہے جو میری روح تیری روح سے کرتی ہے۔ آہ! میں خواہش کرتا ہوں گائے جا؟

گا کہ زندگی کیا ہے، سنا کہ روح کیا ہے، محبت کیا ہے، تاکہ میں سمجھوں اپنی اُس نازنین روح کے ساتھ گا جو پھولوں کی خوشبو کی طرح عطر پاش ہے، اپنی دل گداز آواز کے ساتھ گا۔ جو نغماتِ سماوی کی طرح دل پر اثر کرتی ہے، دنیا سے میرا علاقہ قطع کر دے۔ میری خواہشیں، میری حسرتیں جو نہیں جانتیں کہ ختم ہونا کیا چیز ہے، انھیں اس طرح، بس اس طرح ختم کرنا چاہتا ہوں کہ اُس آغوش کے نرم آغوشیوں میں، اُس آہنگِ دل کی رقّت میں، اُس نوائے شفقت کی لطیف موج میں غرق ہو کر مر جاؤں تیری باریک اور سُریلی آواز کی تہیں میرا کفن ہوں، اُس میں لپٹ لپٹ کے مرجاؤں اُسی چوم چوم کر جان دے دوں، اُس ہوا سے زیادہ ہلکی، آسمان سے زیادہ صاف آواز میں لپٹ کر اونچا اڑ جاؤں اور میری آنکھیں اور کان حشر تک اُس باریک، کانپنے والی آواز کو، اُس صدا کو جو اک ننھی چڑیا کے ننھے بازوؤں کی طرح پھڑپھڑاتی ہے، بلبلوں کے منقاروں میں،

اک مغنیہ سے التجا

گائے جا، سُنائے جا، اللہ کے واسطے گائے جا، ٹھیر مت، رباب کے ساتھ، ستار کے ساتھ، میرے دل کے ساتھ، گائے جا! یہ میری التجا وہ التجا ہے جو میری روح تیری روح سے کرتی ہے، اپنی ستار کو چھیڑ، آہ! میں التجا کرتا ہوں گائے جا!

تیری آواز۔ وہ باریک، وہ بلوریں، وہ تیرے دل کی طرح صاف اور شفاف، وہ تیرے ننھے دل کی طرح تیری ننھی آواز، مجھے آغوش میں لے لے، مجھے بھسلائے؛ وہ آواز جو تیرے رقیق قلب کے گوشوں سے نکلتی ہے، اور جامۂ ماسوا کو اُتار کر عُریاں اور گریاں اوپر کی طرف جاتی ہے، اور پھر اک پُرناز لرزش کے ساتھ واپس آکر تیرے ہونٹوں میں چھُپ جاتی ہے۔ وہ آواز جو خود اک شعر ہے۔ اُس منظوم آواز کے ساتھ گائے جا میری روح کی سی نحیف، میرے دل کی سی کانپنے والی، نازک

مجھسے قوم کی اُمیدیں وابستہ ہوں، میں قوم کو شاہ راہِ ترقی پر لیجاؤں، میں اُن کے حقوق کی حفاظت میں رات دن کوشاں رہوں، اسی دُھن میں راتوں کو نہ سوؤں، دنوں کو مصروف رہوں۔

ہاں! میری تلوار کی جھنکار سے زمانہ گونج اُٹھے۔ میرے نام کی آتے ہی شیروں کا زہرہ پانی ہو جائے، میری جہاں گیرانہ سطوت کی مدح میں نئے فردوسی اور ہومر پیدا ہوں، میں اور موت ہم مشرب رفیق ہوں، میں جبار بنوں اور جباروں کو ستانے والا۔ تاریخ میں میرا نام خون اور شعلے سے لکھا جائے: میں بزرد آزما بننا چاہتا ہوں۔

یہ میرا دماغ کہتا ہے۔

مگر وہ گوشت کا ٹکڑا جو تو نے میرے سینے میں پیدا کر دیا اور جو اب بھی ہر وقت کی طرح دھڑک رہا ہے اور جب تک میں زندہ ہوں دھڑکا کرے گا اور مجھے مصیبت میں ڈالا کرے گا کہتا ہے:

"نہیں میں شہرت نہیں چاہتا، میں محبت چاہتا ہوں، سوزِ الفت چاہتا ہوں، چاہتا ہوں کسی ایک کے لئے تڑپوں، کسی ایک کے لئے دھڑکوں، کسی ایک پر فدا ہو جاؤں"۔

مرے دوستانے والے

میں چاہتا ہوں کہ لوحۂ عشق کی نقّاشی کروں، حسن، جذباتِ محبت اور خیالاتِ سودا کی تصویریں لفظوں میں، منظوم لفظوں میں، شعر میں کھینچوں۔ میرا کلام اہلِ درد کو رُلائے، اہلِ ہمّت میں جوش پیدا کرے اور حسرت زدوں کی تمناؤں اور حسرتوں کی ترجمانی کرے۔ میں اک قوم کی زبان بنوں: میں شاعر ہونا چاہتا ہوں۔

میں مصوّر ہونا چاہتا ہوں: میں چاہتا ہوں کہ اصل میں لوحۂ عشق کی نقّاشی کروں؛ حسن، جذباتِ محبت اور خیالاتِ سودا کی تصویریں، حقیقی تصویریں کھینچوں، شاعر جو سوچتا ہے میں اُس کی صورت بنا کے دکھا دوں۔ میری رنگ آمیزیاں صفحۂ قرطاس پر نیچر کا باغ کھلائیں، حسین اور دل آویز خیالات کو مجسم کر کے دکھائیں۔

میں سردارِ قوم ہونا چاہتا ہوں: گھر گھر میرا نام عزّت سے لیا جائے

مرصع شامیانہ کی طرح نظر آتا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پھولوں سے لدی ہوئی اور ہریائی میں چھپی ہوئی دنیا، ہنس ہنس کے، چمک چمک کے اگر میری ضعیف روح کو آسمان کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کرے تو وہ قبول کرلے گا۔

پیدا ہوتے وقت رونا؛ بہت اچھا مانا؛ مگر نا امیدی کے ساتھ مرنا؛ اس کی ضرورت سمجھ میں نہیں آئی، میں ایک پُرنشہ وداع کو غمگین وصال پر ترجیح دیتا ہوں، اور یہی سبب ہے، آہ! یہی سبب ہے کہ چاہتا ہوں کہ دغدغۂ حیات کو بہار کے پُرشوق زمانہ میں، جب پھول کھل رہے ہوں اور دنیا میری طرف ہنس رہی ہو، اور میں دنیا کی طرف، ایسے وقت میں دنیا کو الوداع کہوں۔

عالم حیات کو نیند آنی شروع ہوئی اور اُس کے چہرہ پر نقاب پڑتی جاتی ہے۔

میرے پیارے! تمھیں یہ وقت اور یہ مقام یاد آیا؟ تم اس وقت مجھ سے کہہ رہے تھے :" وادی کا سایہ کس قدر لمبا ہو گیا ہے کیسا سکوت ہے سامنے کے ساحل کے درختوں کا سایہ ہم تک آرہا ہے اُس مکان سے جو دھواں نکل رہا ہے۔ دیکھو کیسا سیدھا آسمان کی طرف جارہا ہے، آہ؟ جو شخص یہاں پلے، یہاں بڑھے، یہاں زندگی بسر کرے وہ بُرا آدمی نہیں ہو سکتا، وہ دل جو اس ہوا میں سانس لے، وہ ملوّث اور داغدار نہیں ہو سکتا"۔

بے شک اے میری جان سے زیادہ مجھے پیارے! ہر روح اس وادی میں صفائے روح محسوس کرتی ہے۔ مسجد سے سکون فریب آواز کے ساتھ مؤذن کی اذان، صومعہ سے ناقوس کی پرعظمت صدا، اور کلیسا سے گھنٹے کی کانپتی ہوئی گونج اور شام کا وقت، کیا کیا خیالات پیدا ہوتے ہیں اور بہار کی رات! پُرشوکت رات! انسان کو لذتِ ابد عطا کرتی ہے۔ اس خاکدان کے ہر جگنو کے مقابلہ میں آسمان پر ایک ستارہ نکلتا ہے آسمان اور زمین ایک خاموش نغمہ گاتے ہیں۔ آسمان روشن اور

یہ چاہتا ہی کہ اُسی دامانِ کوہ میں، انھیں سرو کے درختوں کے سایہ میں
میرے جسم کو دفن کردیں، اور اگر میں اس قابل ہوں تو میرے لئے رونے
والوں کے آنسو (کہ یہی میری حسناتِ عمر کا نتیجہ ہونگے) اُس ہنستے کھیلتے دریا
میں جو اس وادی میں بہتا ہی مل جائیں، نابود ہوجائیں۔

پیارے دوست! تمھیں یاد ہی کہ نہیں؟ بہار کا موسم تھا، شام کا
وقت تھا، وادی (میں نام نہیں لوں گا، غیر پہچان جائیں گے) میں دریا
کی موجیں ساحل کی گردن کو چومتی تھیں اور ہلکی ہلکی لوریاں گاتی تھیں۔

افق میں آفتاب کی پژمردہ شعاعیں، بادلوں میں رنگ برنگ کا ہالہ
بناکے نکل رہی تھیں۔ فضائے وادی میں نہ ہوا تھی نہ حرکت تھی صرف دریا
کے نیل گوں پانی پر آفتاب کی شعاعوں کے مقابل، ایک کشتی تھی جو گویا
ایک بیہوشی کے عالم میں جارہی تھی۔ یکایک دُور سے ایک قاز کی فریاد انگیز
آواز آئی، دوسری نے جواب دیا، تیسری چلّائی، اور پھر خاموشی طاری
ہوگئی۔ وادی، ایک ضعیف عاشق کی طرح اپنی آغوشِ آسمان کی طرف
پھیلائے ہوئے اُسے اپنی طرف بلارہی تھی کہ فضائے عالم میں نہایت ہی
خفیف اندھیرا چھانا شروع ہوا۔ خاموشی کچھ اور بڑھی، ایسا معلوم ہوا کہ

جہاں پھول کھلتے ہیں

جہاں پھول کھلتے ہیں، اور گلاب کی خوشبو شام کے سایہ میں پھیلتی ہے، ایسے وادی کے خاموش گوشہ میں، جہاں نہ دبدبہ ہو، نہ دغدغہ زندگی بسر کرنے کا لطف ہے۔

جب پھول کھلتے ہیں اور یہ کثیف اور ترش رو دنیا ہنسنے لگتی ہے، ہوا میں حسّ عشق سے مشابہ آہنگِ نرم، ایک اسرار انگیز خفیف روانی پیدا ہوتی ہے، جب فرشتہ گُل شب کے مونھ کو کھولتا ہے اور بادلوں کو رنگین کرتا ہے اُس وقت بہار کے موسم میں ایک شام کو مرجانے کا لطف ہے۔

جس وقت کہ ہلکی ہلکی ہوا چلتی ہے، اور وادی کی سطح پر زمردیں ٹیلوں پر، اور زمردیں دامنِ کوہ پر، بادلوں کا سایہ اس طرح آتا ہے جس طرح فرشتے آسماں سے اُترتے ہیں، اور میری روح کو تلاش کرتا ہے اُس وقت میری روح چاہتی ہے کہ پھولوں میں سے نکل کے بادلوں سے جا ملے اور میرا دل

اس کے کھنڈر تو باقی ہوں اور نہ باقی ہوں تو عباسیوں کے جاہ و جلال کے نشان! مگر بابل کو ہلاکو نے تھوڑا ہی تاراج کیا تھا۔

کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ جو قوم بغداد کو تباہ کرے، اسی کی ایک شاخ جامع مسجد و قلعۂ دہلی، تاج محل آگرہ جیسی عمارتیں ہندوستان جا کر بنائے؛ کیا یہ مغلوں کی طرف سے تباہی بغداد کا نادانستہ کفارہ تھا؟

بہر حال اے بدبخت دہلی و آگرہ! تم پھر بھی خوش نصیب ہو کہ تمھاری بہت سی عمارتیں قائم ہیں؛ اور تمھارے کھنڈر ابھی غائب نہیں ہوئے، مگر اے بغداد؟ — ؟

شیخ، اور امام ابو حنیفہؒ کے مزاروں کی عمارتیں بہت اعلیٰ درجہ کی نہیں

تاہم کیا اُن کی شان مزاروں کی رفعت سے مستغنی نہیں؟

مگر دار الخلافہ بغداد کے شاہی محل کہاں ہیں؟ وہ کتب خانہ، وہ

مدرسے، وہ رصدگاہیں کدھر ہیں؟ مدرسۂ نظامیہ کس جگہ ہے؟ قصرِ خلد

کس طرف ہے؟ آہ! یہ سوالات ہلاکو خاں سے کرو۔ ہم کیا جواب دیں۔

شمس العلماء مولانا حالی دہلی کے سیاح سے کہتے ہیں ؎

لیجیے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیاح

دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

لیکن یہاں اس نصیحت کی بھی ضرورت نہیں، کیوں کہ یہاں کھنڈر تک

نہیں رہے۔ ولایتِ بغداد کے سرکاری سالنامہ میں مولف تاریخی عمارات

کے ذکر میں فرماتے ہیں:-

"جہاں آج کل دفترِ نظارتِ رسومات ہے، وہاں مدرسۂ نظامیہ تھا!"

ہاروں اور ماموں کی تمام کوششوں کا یہ نتیجہ ہے!! ہاں ایک زبیدہ کا

مقبرہ ٹوٹی شکستہ حالت میں باقی ہے، جہاں عرب راہزن رات کو جمع ہو کر

مالِ غنیمت آپس میں تقسیم کرتے ہیں۔ بابل جو ہزاروں برس پہلے تباہ ہو

دخترِ معزول سلطان مراد خاں کے ساتھ خفیہ خط و کتابت رکھنے کے جرم میں پکڑے گئے۔ یہ بھی ینگ ٹرکش پارٹی کی ناکام کوششوں سے ایک کوشش تھی، یہاں اس کے حالات مفصل معلوم ہوئے ہیں؛ کوشش یہ تھی کہ سلطان عبدالحمید خاں کو معزول کر کے سلطان مراد کو دوبارہ تخت پر بٹھائیں، مگر پوری نہ ہوئی، نوجوان ترکوں کو چھوڑ کر عام اہلِ ملک بہت وفادار معلوم ہوتے ہیں۔

اللہ اللہ! بغداد کی خاک میں کیسے کیسے بزرگ سوتے ہیں، امام موسیٰ کاظم و امام محمد تقی علیہم السلام، شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ؛ ان کے مزاروں کی زیارت میں نے کی اور ہر جگہ نہ معلوم کن کن خیالات کا ہجوم؛ افسوس ہے کہ میں مذہبی آدمی نہیں اور نہ مجھے مذہبی واقفیت ہے تاہم میرے بے بہرہ دل پر اس امر کا اثر ہوتا تھا کہ میں ان بزرگوں کی حضوری میں ہوں جو اپنے علم، اپنی فضیلت اور اپنے تقدس کی وجہ سے اسلام اور مسلمانوں کے لئے باعثِ فخر و سببِ برکت تھے۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا مزار نہایت ہی شاندار ہے؛ مگر

پولیٹیکل نجات دہندہ سمجھتا ہوں۔ اس پارٹی والے بیچارے، لندن اور
پیرس میں جا جا کر جلسے کرتے ہیں، وہاں سے اخبار نکالتے ہیں، مگر ان کے
ہمدرد یہاں جز آں کہ بصدق دل دعائے بکند اور کچھ نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ
پارٹی ہمیشہ ایسی خستہ حالت میں نہیں رہی، جب رئیس الاحرار مدحت پاشا
کا دور دورہ تھا، تو اس پارٹی کا زور تھا، اور سنہ ۱۸۷۶ء میں ٹرکی کو
پارلیمنٹ نصیب ہوگئی تھی! کاش وہ دورہ قائم رہتا، تو آج ٹرکی
کا چھوٹا بھائی جاپان اکیلا ترقی نہ کرتا، بلکہ ترقی کی بساط پر اس کے
ساتھ یہ بھی بیٹھی ہوتی۔

اس پارٹی کے چند ممبروں سے میری بھی ملاقات ہوئی اور تبعۂ دولتِ
اجنبی سمجھ کر اپنے خیالات کو انھوں نے مجھ سے نہیں سمجھایا، اُن کی لیاقت
اُن کی وسعتِ نظر، اُن کی حُبِّ وطن اور حبِّ ملت دیکھ کر مجھے تعجب
ہوتا ہے کہ یہ لوگ ملک کے دشمن سمجھے جاتے ہیں۔ یہ لوگ سلطان عبدالحمید خان
سے بالکل خوش نہیں، اور انھیں ہمیشہ تخت سے اُتارنے کے درپے
رہتے ہیں، ابھی حال ہی میں ریوٹر نے اطلاع دی تھی کہ خود سلطان کے
داماد کامل پاشا مع بہت سے اعلیٰ عہدہ داروں کے شاہزادی خدیجہ

تعریف سنتا تھا[1]، وہ بہادر اور توانا ضرور ہیں، مگر اتنا کہنا پڑتا ہی احمد فیضی پاشا مشیر (کمانڈر انچیف) ولایت بغداد، عساکرِ عثمانیہ کو اچھی حالت میں نہیں رکھتے، وردیاں پھٹی ہوئی ہیں، جوتے ٹوٹے ہوئے ہیں اور وہ اس حالت میں سڑکوں پر پڑے پھرتے ہیں۔ میں سنتا ہوں کہ ممالکِ عثمانیہ کے دیگر ولایات میں ایسی ابتر حالت میں نہیں ہیں۔ انھیں خرابیوں کے دفع کرنے کے لئے سلطنتِ عثمانیہ میں نئے تعلیم یافتوں کی ایک پارٹی ہی جسے یہاں عام طور پر اس کے فرانسیسی نام جون ترک (نوجوان ترک) کے نام سے پکارتے ہیں اور جسے انگریزی اخبارات ینگ ٹرکش پارٹی کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ یہ پارٹی ٹرکی کی نیشنل کانگرس سمجھنی چاہیے۔ صرف فرق اس قدر ہی کہ اس ٹرکش نیشنل کانگرس کے ممبر ٹرکی میں اپنی زبان نہیں کھول سکتے اور انڈین نیشنل والے دھڑلّے سے ہندوستان میں جلسے کرتے ہیں اور اخبار نکالتے ہیں۔ بانی اس پارٹی کا مرحوم مدحت پاشا تھا، جسے میں اپنے اعتقاد کے موافق ٹرکی کا لبرل سید احمد خاں اور

---

[1] یہ ولایت بغداد کے مشیر ہیں اور اب کوئی سال بھر سے والیٔ بغداد (گورنر جنرل بغداد) بھی ہیں۔ یہاں عام طور پر ان کے انتظام سے ناراضی پھیلی ہوئی ہے۔

اپنی چھوٹی چھوٹی وردیوں اور لال لال ٹوپیوں میں بہت ہی بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ کیا خبر ہی کوئی آیندہ زمانہ کا عثمان پاشا ان ہی میں پڑھ رہا ہو؟

یہاں تعلیمِ نسواں کے معنی صرف مضامین متعلق تعلیمِ نسواں لکھنا نہیں ہی عیسائیوں اور یہودیوں کے تو بہت سے مدارسِ نسواں ہیں اس کے کہنے کی ضرورت نہیں، مسلمانوں کے لیئے بھی ایک مکتبِ نسواں ہی؛ جو ہائی اسکول کے درجہ تک ہی۔ اور اس میں ترکی اور بعض عربی خانمیں پڑھتی ہیں۔ خانموں کے ذکر میں پردہ کا ذکر بھی بے موقع نہ ہوگا یہاں تمام مسلمان عورتیں، ادنیٰ اور اعلیٰ درجہ کی برقعہ اوڑھ کر خود بازار جاتی ہیں اور خود خرید و فروخت کرتی ہیں۔ ترکی خانموں کا پردہ بالکل برائے نام ہوتا ہی، اُن کے چہرہ کا نقاب اس قدر باریک ہوتا ہی کہ بعض اوقات قریب سے دیکھنے والوں کو چہرہ صاف نظر آتا ہی۔ لباس ترکنوں کا بالکل انگریزی ہی، لیکن عربنوں کا عربی ہوتا ہی۔

ترکی حکومت کا سول انتظام کیسا ہی ہو اور خدا شاہد ہے کہ اس میں اصلاح کی سخت ضرورت ہی، لیکن میں افواجِ عثمانی کی بہت

دفاتر ہندوستان کے دفتروں کے بلکہ ان سے بہتر سجے ہوئے ہیں۔

مدینۃ العلم والفضل بغداد، اپنی تمام فضیلت کھو بیٹھا ہے۔ مدرسۂ نظامیہ کے شہر میں آج پرانی یا نئی تعلیم کا کوئی ایسا مدرسہ نہیں ہے جسے کالج کے لقب سے یاد کیا جائے۔ ہاں دس بارہ اسکول ہیں، جن میں زیادہ تر یہود اور نصاریٰ کے یا امریکن مشن، پروٹسٹنٹ مشن فرنچ کیتھولک مشن کے ہیں، یہ اسکول ہندوستان کے مشنری اسکولوں کی طرح بہت منتظم اور عمدہ حالت میں ہیں، مسلمانوں کی طرف سے کوئی اسکول نہیں۔ صرف حکومت کی طرف سے چند اسکول ہیں۔ مثلاً مکتب ابتدائیہ مکتب رشدیہ، مکتب اعدادیہ، مکتب صنائع۔ مگر اہلِ شہر عرب مسلمان ان میں بھی کم پڑھتے ہیں، ترک ہی زیادہ تر ان مدرسوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

مکتب اعدادیہ، فوجی اسکول ہے، یہاں سے تعلیم پاکر طلبا قسطنطنیہ کے ملٹری کالج میں بھیجے جاتے ہیں۔ اعدادیہ کے سب طالب علم فوجی وردی پہنتے ہیں اور یہ گورے گورے چھوٹے چھوٹے کپتان و کرنیل و جرنیل

ایک مرتبہ صفائی ہوتی ہے۔ صرف میدان یعنی وہ حصہ جہاں ترک رہتے ہیں اور کچہریاں ہیں، صاف ہے اور وہاں سڑکیں بھی چوڑی ہیں، مگر کچّی لیکن ع

عیبِ مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

بغداد کے مکان سب پکّے اور شاندار ہیں، دجلہ کے دونوں کنارے قصر بہت خوبصورت اور نئی وضع کے ہیں، سڑک سے مکانوں میں داخل ہوجئے تو تعجب ہوتا ہے کہ مکانوں میں کیسی صفائی رکھی جاتی ہے۔ یہاں عام طور پر لوگ مصارفِ زندگی پر زیادہ خرچ کرتے ہیں، مکانات کے تمام کمرے الافرنگ (یوروپین وضع میں) سجے ہوتے ہیں۔ سلاملق یا مسافر اودھ سی (ڈرائنگ روم) کی آرائش میں بہت صرف کیا جاتا ہے اور اکثر ڈرائنگ روم کے سٹ نہایت خوبصورت اور قیمتی ہوتے ہیں اہلِ بغداد کے شوق کا اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ باوجود اِن سڑکوں کے یہاں بہت سی فٹن اور بگھیاں ہیں اور کم و بیش سو بائسکلیں ہیں جو اِن سڑکوں پر خدا ہی جانتا ہے کس طرح دوڑتی پھرتی ہیں۔

گورنمنٹ ہوس یعنی وہ عمارت جس میں تمام کچہریاں اور دفاتر ہیں اور جسے یہاں سرائے حکومت کہتے ہیں۔ بڑی شان دار عمارت اور

گمرک کے بھینٹ چڑھاؤ۔ ہم نے خوشی خوشی اُس قاضی الحاجات روپیے کو نذر کیا اور گمرک سے باہر آئے، یہاں ایک صاحب نے جو میرے آنے سے واقف تھے مگر مجھ سے واقف نہ تھے ملے، میں نے اپنے تئیں اُن کے سپرد کیا اور اب ہماری پریشانیوں اور تکالیف کا خاتمہ ہو گیا۔ للہ الحمد

... ...

... ...

... ...

آج مجھے بغداد میں دو مہینے ہو گئے ہیں! اس لئے اس کی متعلق رائے کچھ دیکھ کر قائم ہوئی ہے! یورپ والے تو ہندوستان کے اعلیٰ سے اعلیٰ شہروں کو بھی خراب کہتے ہیں، لیکن جہاں تک میونسپلٹی کا تعلق ہے، بغداد، ہندوستان کے شہروں سے بھی گیا گزرا ہے۔ یہ نہیں کہ یہاں میونسپلٹی نہیں، میونسپلٹی ہے، اس کا رئیس (پریسیڈنٹ) ہے اور منتخب شدہ اور حکومت کے نامزد کردہ، دونوں قسم کے اعضاء (ممبر) ہیں، مگر شہر کے (اور شہر چھوٹا نہیں، بڑا عظیم الشان شہر ہے) تمام گلی کوچے کچے ہیں۔ کوئی پکی سڑک نہیں، کوچے تنگ اور پیچدار جن میں ہفتہ بھر کوڑا پڑا رہتا ہے، ہفتہ میں

کرلی اور کن کن واقعات کو مجسم کر کے اپنے سامنے بلایا! مگر گمرک پہ پہونچا تھا کہ "سبک سیر خیالات عہدِ خلافتِ عباسیہ سے بڑی بیدردی سے واپس بلائے گئے۔ کشتی والوں اور حمّالوں کی ایک فوج سے میں محصور کر لیا گیا۔ جنھوں نے بڑی فصاحت اور روانی کے ساتھ مجھے عربی سنانی شروع کی، اور میری طرف سے اُس عربی کی داد نہ ملنے پر کسی نے بکس اٹھایا، کسی نے بستر۔ میں کچھ فارسی کی لیاقت جتاتا ہوں اور کچھ ترکی کی ٹانگ توڑتا ہوں، مگر وہاں کون سنتا ہے، آخر یہ ہی مناسب سمجھا کہ اگر اسباب گم کرنا منظور نہیں ہے تو ان لوگوں کے ساتھ ہو لینا چاہیے ؎

رشتہ در گردنم افگندہ "دوست"

می برد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست

اسباب ایک کشتی میں رکھ دیا گیا، اور میں بھی اس طرح گویا اسباب کا ایک جُز ہوں، ایک کونے میں کو رکھ دیا گیا، اور یوں یا بہ دستِ دگرے دست بدستِ دگرے، ہم (یعنی میں اسباب) گمرک پہنچے اور وہاں اپنی قلیل ترکی دانی نے اس قدر سمجھا دیا کہ اگر اپنا کل اسباب بکھروانا نہیں چاہتے، اور اپنی کل کتابیں ضبط کرانا نہیں چاہتے تو ایک روپیہ افسر

برس اوّل مدنیت سے ایسی ترقی کی ہو کہ بابل و نینوا و مدائن کا نام تاریخ میں یادگار رہے، وہاں بیسویں صدی عیسوی میں بادیہ نشین عرب اپنے خیمے لگائے پڑے ہوں اور تمدن میں صرف اتنے بڑھے ہوں کہ گلے چراتے ہوں کون کہہ سکتا ہے کہ انسانی ترقی دیرپا ہے ؟ اب ہم اُس خطّے میں جا رہے تھے جس کا چپّہ چپّہ قدیم تاریخ کی زینت ہے۔ وہ جہاں بکریاں چر رہی ہیں طاق کسریٰ ہے، وہ مٹی کا ڈھیر جو ملبہ معلوم ہوتا ہے سلوسیا (مدائن) ہے: وہ کونے میں اُفق کے کنارے جو مقام نظر آتا ہے وہاں یونانی جنرل فلاں و فلاں خیمہ زن ہوا تھا، اور وہاں رومن شاہنشاہ کا پرچم لہراتا تھا جب وہ یہاں سے گزرا تھا۔

چوتھے روز یار تھا، گلزار تھا، بادِ صبا تھی، میں نہ تھا ؟ نہیں میں بھی تھا، دن کے نو بجے تھے، آفتاب میں مطلق تمازت نہ تھی۔ ہوا نہایت خوش گوار تھی ! کہ ہم شاہدِ مقصود سے ہم کنار ہوئے یعنی دار السلام مدینہ بغداد پہونچے۔

جہاز آہستہ آہستہ گمرک بغداد (کسٹم ہوس) تک پہونچا۔ اس عرصے میں میرے خیالات نے آہ ! کس کس زمانے اور کس کس وقت کی سیر

آگیا، جہاں دجلہ و فرات کا سنگم ہوتا ہے۔ اور پھر ہمارا جہاز الف لیلہ کے
چہیتے اور شیخ سعدیؒ اور شعرائے عرب کے ممدوح دریائے دجلہ پر چلنا شروع
ہوا۔ اللہ رے دجلہ کی پیچیدگیاں! شاید ہی کوئی دریا اس قدر پیچ
اور چکر کھاتا جاتا ہو۔ اس وجہ سے جہاز بہت کم فاصلہ طے کر سکتا تھا۔ اگر
دریا سیدھا بہتا تو جہاز زیادہ فاصلہ طے کرتا، مگر مجھے ایسے پرلطف منظر
کب نظر آتے؟ ہاں اس وقت یاد آیا، فاؤ سے بصرے تک کے منظر کی میں
نے بے حد تعریف کی تھی اور لکھا تھا کہ میں سنتا ہوں کہ بصرے سے بغداد تک
دریا کے دونوں کناروں پر ایسے گھنے درخت نہ تھے جیسے فاؤ سے بصرے
تک تھے، لیکن پھر بھی بڑے اعلیٰ درجہ کے اور دل کش نخلستان نظر آئے جو
شادابی میں تو بصرے کے نخلستانوں سے شاید بڑھے ہی ہوئے تھے
اور دجلہ کے کنارے صحرانورد بدوؤں کے خیمے بھی نظر آئے۔ ہمارے جہاز
کو دیکھ کر یہ لوگ کنارے پر ساتھ ساتھ دوڑتے اور چیختے چلاتے تھے اور
جہاز کے مسافر اُن کے لیے خرمے اور نارنگیاں پھینکتے تھے جنھیں وہ بڑے
شوق سے اُٹھاتے تھے اور ناچتے تھے، اُن لوگوں کو دیکھ کر مجھے خیال آتا
تھا کہ یہ بھی قضا و قدر کا ایک چھوٹا سا مذاق ہے کہ جن ممالک میں ہزاروں

محاصرۂ چتور گڑھ کے واقعات "مجیدیہ" پر بھی ہو رہے ہیں اور ہیلن اور پدمنی کی ایک جانشیں دو یہودی خاندانوں کے امن و امان میں خلل انداز ہی، یعنی ایک نہایت حسین لڑکی مع اپنے والدین کے بغداد جا رہی تھی اس لڑکی کی شادی بغداد کے ایک نوجوان یہودی سے ٹھیری تھی، وہ بھی ساتھ تھا لیکن جہاز پر ایک دوسرا نوجوان مع اپنے والدین کے تھا۔ یہ لوگ اس بات پر اڑے ہوئے تھے کہ اول الذکر نوجوان سے شادی نہ ہونے دیں بلکہ اس لڑکی کو اپنے گھر کا نور بنائیں۔ روزانہ تینوں خاندانوں میں کسی نہ کسی بہانے سے لڑائی ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ بعض اوقات کپتان کو دخل دینا پڑتا تھا ؎

شہر ہیم ست کزیں فتنہ پر آشوب شود
ایں قدر نیز نباید کہ کسے خوب شود

مگر ہیلنیوں اور پدمنیوں کے لئے پیرس اور علاء الدین خلجی ضرور پیدا ہو جاتے ہیں جو اُن کی خاطر ہزار ہا خلقِ خدا کا خون کر دیتے ہیں یہاں اگر تین خاندانوں میں لڑائی ہو گئی تو کونسا تعجب ہی!۔

دوسرے روز شط العرب (جسے میں نے اس سے قبل دجلہ و فرات کا مجموعہ پانی، نام نہ معلوم ہونے کی وجہ سے کہا تھا) ختم ہو گیا، یعنی وہ مقام

کی ضرورت ہوتی ہی تو انھیں کے آگے دستِ سوال دراز کرتے ہیں۔ اس وقت بغداد میں کوئی مہاجن اور بینکر غیر یہودی نہیں ہی۔

یہ تو اُس دولت کا حال ہی جو چلتی پھرتی چھاؤں کی کہی جاتی ہی (گو یہ چلتی پھرتی چھاؤں اُن کے پاس سے چلتی پھرتی نظر نہیں آتی) مگر قدرت نے ایک دولت یہاں مساوی تقسیم کی ہی اور وہ دولت حسن ہی۔ یہود و نصاریٰ وارمنی و عرب، عراق کی سب قومیں اس سے برابر بہرہ مند ہوئی ہیں، جہاز پر سوائے میرے اور چند دیگر ہندیوں کے جو کربلائے معلیٰ کی زیارت کو جا رہے تھے کوئی سانولا نہ تھا، یہ تو مردوں کی کیفیت تھی، اور عورتوں کے حسن کا عالم تو یہاں کچھ اور ہی ہی۔ میں نے بغداد میں ابھی تک سوائے حبشیوں کے کوئی کریہ المنظر عورت نہیں دیکھی۔ حسن یہاں سب میں یکساں ہی۔ لیکن چونکہ عیسائیوں اور یہودیوں میں پردہ مطلق نہیں، اس لئے جلبِ نظر یہ زیادہ کرتی ہیں۔ عراق کشمیر یا یورپ کی طرح سرد ملک نہیں، قریب قریب ہندوستان کے برابر گرم ہی۔ پھر آخر کیا وجہ ہی کہ قدرت نے یہ نعمت بھی یہاں کے لوگوں کو ایسی دریا دلی سے دے رکھی ہی؟ جہاز پر بھی مجمع حسینوں کا غیر معمولی تھا اور دوسرے روز مجھے معلوم ہوا کہ چھوٹے پیمانہ پر محاصرۂ ٹرائے اور

نہ سیکھی تھی، اس لئے مقابلہ برابر کا تھا، تاجر سچّے سیدھے لوگ ہوتے تھے، لیکن پھر یہودیوں نے امریکن ٹرسٹ کا قاعدہ اختیار کیا، جس میں تاجر کا مقصد شروع شروع میں نفع حاصل کرنا نہیں ہوتا بلکہ اپنے حریف کو نقصان پہنچانا، اس لیے وہ حریف کو تباہ کرنے کے لئے اپنا مال ایسا کوڑیوں کے مول بیچ دیتا ہی کہ خود بھی تباہ ہوجاتا ہی اور جب مقابلہ کے لیے کوئی نہیں رہتا، تو میدان اُس کے ہاتھ میں ہوتا ہی اور پھر وہ آہستہ آہستہ تجارت کا مالک بلا شرکتِ غیرے ہوجاتا ہی۔ اس وقت اسی طریقے سے یہودیوں نے مسلمان اور نصاریٰ کو تجارت کے میدان سے نکال دیا ہی اور اس وقت بصرہ اور بغداد کی تین چوتھائی دولت اور تجارت اُن کے ہاتھ میں ہی۔ یہودیوں کے بعد نصاریٰ کا نمبر ہی اور مسلمان تیسرے درجے پر ہیں۔ عراق و شام کے یہودی بھی قدامت کے لحاظ سے عجیب قوم ہیں اہل بابل انھیں قید کرکے لائے اور حالتِ جلاوطنی میں اُنھوں نے دولت پیدا کرنی شروع کی، یونانی و رومی و عرب و عجم و مغول و ترک نے یکے بعد دیگرے حکومت کی مگر اس قدیم قوم نے ان سب کو اپنی دولت کا چوکیدار سمجھا اور سمجھتی ہی اور انھیں اُن کی چوکیداری کا حق دیتی ہی اور خود دولت پیدا کرنے میں مشغول رہتی ہی۔ چوکیدار کبھی کبھی انھیں ذلیل سمجھتے ہیں مگر روپیہ

جو قدم پڑتا تھا، اُس میں ایک خاص غرور کی شان تھی، کیونکہ اب ہم آزاد تھے
اور اس لفظِ آزادی کے معنی کی تہ پر ہم اب پہنچے تھے۔

سہ پہر کو جہاز بصرے سے روانہ ہوگیا؛ اور اُس وقت میں نے اطمینان
سے جہاز کا چکر لگانا شروع کیا، فسٹ کلاس میں صرف ایک ترک مصطفےٰ
فہمی آفندی ناظر دیوانِ عمومیہ ولایت بغداد تھے، دوسرا مسلمان میں تھا، میں
بھی مجبوری سے اس کلاس میں تھا، کیونکہ سیکنڈ کلاس میں بالکل جگہ باقی نہ تھی
باقی سب یہود و نصاریٰ تھے، سیکنڈ کلاس بالکل یہود و نصاریٰ سے پُر تھی،
صرف ایک تھرڈ کلاس تھی جس میں شوکتِ اسلام ظاہر ہو رہی تھی! اللہ اکبر!
مسلمانی حکومت میں بھی دولت اور دولت کے ساتھ عیش و آرام دوسری
ہی قوموں کے پاس ہے! تھوڑی دیر بعد کپتان سے (یہ یاد رہے کہ جہاز ایک
انگریزی کمپنی کا ہے اور کپتان انگریز ہے) باتوں میں اس کا ذکر آگیا، تو اُس
نے عجیب باتیں بتائیں۔ یہ کپتان بیس برس سے اس جہاز پر ہے اس لئے
اُس کا تجربہ کوئی آج کا تجربہ نہیں ہے۔ اُس نے کہا کہ تیس برس پہلے بغداد کے
مسلمان تاجر کسی طرح یہودیوں سے کم نہ تھے بلکہ بڑھ کے ہی تھے۔ لیکن
اس وقت یہودیوں نے یوروپین یا کہنا چاہیئے امریکن ڈھنگ کی تجارت

بادبانی جہاز لیئے پھرتے تھے، یا اب بصرہ سے بمبئی تک بھی نہیں لے جاسکتے اس کو سُن کر ایک آہِ سرد بھری اور فرمایا "میاں تم ابھی بچے ہو، تم ان باتوں کو کیا جانو، یہ خدائی کارخانے ہیں، ہر کسے پنج روز نوبتِ اوست۔ اب عرب وحشی اور جاہل ہیں، اب جو لوگ اس کے اہل ہیں اُن کے پاس یہ کام گیا۔" یہ فرمایا، اور اُس نورانی چہرے پر دو بڑے بڑے آنسو ڈھلکتے نظر آئے اور پھر وہ یکایک نظروں سے غائب ہو گئے۔

اس تقریر کا مجھ پر بھی بہت اثر ہوا، بڑی دیر تک میں خیال میں محو رہا اور پھر میں نے سوچا تو دیکھا کہ اُن کا فرمانا صحیح تھا۔ انّا للہ وانّا الیہ راجعون

(۲)

بصرہ تا بغداد

رسید مژدہ کہ ایّامِ غم نہ خواہد ماند چناں نماند چنیں نیز ہم نہ خواہد ماند

چنانچہ ایسا ہی ہوا، ہمارا بھی زمانہ رنج ومحن یعنی قرنطینہ ختم ہوگیا، اور ہم اپنے قفس سے با بال وپر نکل آئے۔ قسمت کا ستارہ اوج پر تھا یعنی اُسی روز "مجیدیہ" نامی جہاز بغداد کو روانہ ہونے والا تھا، بعد "خرابی بصرہ" قرنطینہ کے مکان سے سیدھے جہاز پر پہنچے۔ اب جہاز پر

کے مسلمانوں کا لباس سمجھتے تھے۔ مجھ سے کہنے لگے کہ یہ تو ترک معلوم ہوتے ہیں، اور اُن میں سے دو ایک کی تصویر کی بہت تعریف کی۔ میں نے کہا یہ کیا ہیں، ہمارے کالج میں ان سے بڑھ بڑھ کر ہیں۔

جن صاحبوں کی تعریف ہوئی ہے، میں اُن کے نام نہیں لکھنے کا، جب خدا ملائے گا، تو بتاؤں گا۔ (فی الحال سب دوست سمجھیں کہ انھیں کی تعریف ہوئی ہے)

لوگ یقین نہ کرینگے، مگر مجھے سندباد صاحب سے بھی نیاز حاصل ہوا، اب تو نہایت معمر ہو گئے ہیں، اور جیسا سب جانتے ہیں، مدت مدید سے خانہ نشین ہیں، اور سیاحت ترک کر دی ہے۔

میں نے عرض کی کہ اب سیاحت کو کیوں تشریف نہیں لے جاتے، فرمایا کہ اب سیاحت کا اور جہاز رانی کا کیا لطف؟ دخانی جہاز میں بصرہ سے بیٹھو، جہاں چاہو، چلے جاؤ۔ نہ خوف نہ خطرہ، نہ جہاز کی تباہی، نہ نئے نئے جزیروں کا ملنا۔

میں نے عرض کیا۔ آپ نہیں تو آپ کی قوم، جو جہاز رانی میں سب کی اُستاد رہی ہے وہ تو کچھ کرے یا تو عرب دنیا بھر میں جہاز ا ور وہ بھی

یہودی عموماً عبا و قبا پہنتے ہیں، اور عرب تو بالکل یہی۔ ترک سب یورپین لباس پہنتے ہیں، اور اپنے تئیں یورپین سمجھتے ہیں، یعنی عربوں، یہودیوں اور ارمنیوں سے بالاتر۔

مگر میں دیکھتا ہوں کہ یہاں سرکاری نوکر ارمنی زیادہ ہیں، اور ترک کم، اب تک مجھے پانچ چھ ترکی حکام سے واسطہ پڑا ہے۔ اُن میں سوائے احمد بک کے جو بصرہ کے سول سرجن ہیں، باقی سب (یعنی ڈاکٹر قرنطینہ و ہیڈ کلارک وغیرہ) گریک یا ارمنی ہیں۔

احمد بک نوعمر آدمی ہیں۔ ڈاکٹر کیسے ہیں یہ تو میں نہیں جانتا، مگر فیشن ایبل جنٹلمین بہت زیادہ ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ کپڑے ابھی پیرس سے سلوا کر منگوائے ہیں۔

اس معاملے میں ہمارا علی گڑھ کالج دب کے نہیں رہا۔ قیدِ تنہائی میں، بیٹھا بیٹھا دوستوں کی تصویریں اور گروپ جو ساتھ لایا ہوں، دیکھا کرتا ہوں، وہ دو ارمنی بھی جو ساتھ ہی قید میں آئے، اور تصویریں دیکھنے لگے! وہ پوچھنے لگے، کیا یہ سب ہندوستانی ہیں؟ میں نے کہا، ہاں، تو انھیں یقین نہ آتا تھا، کیوں کہ وہ تو بمبئی کے بوروں اور خوجوں کا لباس ہی ہندوستان

دونوں ارمنی بمبئی میں تجارت کرتے ہیں اور اپنے وطن بصرہ کو آرہے ہیں، جب وہ عربی میں باتیں کرتے تھے، تو مجھے مخالفین عربی بہت یاد آتے تھے، کہ کاش وہ انھیں دیکھیں اور بتائیں کہ عربی نے ان پر کیا ستم ڈھایا، اچھے خاصے انگریز بنے ہوئے تھے۔

یہاں قوموں میں بہت مغالطہ ہوتا ہے مسلمان، عیسائی اور یہودی عبا اور قبا بھی پہنتے ہیں اور بہت سے کوٹ پتلون پہنتے ہیں، ترکی ٹوپی سب اوڑھتے ہیں اور تو اور ناموں سے بھی تو پتا نہیں چلتا، کہ کون مسلم ہے اور کون غیر مسلم۔ میرے ساتھی ارمنی جو تھے، اُن کے نام تھے نصر اللہ مسیح۔ اور شکر اللہ صباغ

یہاں ایک اور عجیب بات دیکھی، ہمارے ہاں تو انگریز عموماً اس بات کو پسند نہیں کرتے، کہ ہندوستانی انگریزی کپڑے پہنیں، اور خاص کر یہ کہ انگریزی ٹوپی اوڑھیں، یہاں ترک اس بات کے خواہش مند ہیں کہ سب اُن کی ٹوپی اوڑھیں۔ چنانچہ یہ دونوں ارمنی انگریزی ٹوپی پہنتے تھے بصرہ پہنچتے ہی، ترکی ٹوپی پہننے لگے، میں نے پوچھا تو کہا، ہم ترکی رعایا ہیں، لہٰذا ہمیں یہاں ترکی ٹوپی پہننی ضروری ہے۔

قسمت میں یہ لکھا تھا۔

اب تک منظر ہی دیکھے، یا کسی آدمی سے بھی ملا؟ ہاں کیوں نہیں۔ کراچی جہاز پر بیٹھتے ہی مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ اب زیادہ تر واسطہ ایرانی، عرب، یہودی، ترک اور ارمنیوں سے ہو گا۔

جہاز پر میرے ہم کلاس تین صاحب تھے، ایک ایرانی، دو ارمنی، ایرانی صاحب کو اول تو میں انگریز سمجھا، باتیں کرنے سے خیال ہوا (چونکہ انگریزی ٹھیک نہیں بول سکتے تھے) کہ فرنچ ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ایرانی ہیں۔ آقا محمد نمازی شیرازی نام ہے۔ شنگھائی سے آرہے ہیں، اور وطن جا رہے ہیں، شنگھائی میں بہت بڑے تاجر ہیں۔ یہ سن کے مجھے بہت بڑی خوشی ہوئی حقیقت میں بعد بمبئی کے مسلمانوں کے اگر تجارت میں کوئی مسلمان قوم ہمت سے کام لیتی ہے، تو وہ ایرانیوں کی قوم ہے، ترکوں کا تو اس میں نام و نشان نہیں۔ شیرازی صاحب اپنے ملک کے شیدا تھے، اور ان کے خیالات سننے کے لیے میں نے خواہ مخواہ ایران اور ایرانیوں پر اعتراضات کرنے شروع کیے، اور مجھے نہایت لطف آتا تھا جب وہ سچے جوش و خروش سے اپنے ملک کی حمایت کرتے تھے۔

ددوڑوں کے تمام جسم سوج گیا) کا رے (ارسے توبہ پھر پیٹھ میں کاٹا۔ اب بغیر اس کے کہ تمام کپڑے اُتار ڈالوں، پسّوؤں کا ملنا مشکل ہی، مچھر کو تو آسانی سے مار بھی سکتے ہیں، کل ڈاک جائیگی، مضمون ختم کرنا ضروری ہی اور یہ کاٹ کاٹ کر بیتاب سکئے دیتے ہیں) نباشد؛ تو یہ مقام بہشت (ہائے! ہائے!! کیسا کاٹتے ہیں، میں باز آیا اس بصرہ سے، اس شدت کے مچھر اور پسّو تو میں نے کہیں نہیں دیکھے) ہے۔

اور یہ خیال رہے کہ مارچ اور اپریل کے بصرہ کا ذکر کر رہا ہوں، ورنہ جون، جولائی میں تو بصرہ کا نام لیتے ہوئے بھی زبان پر چھالا پڑتا ہی، رہا بغداد؛ تو وہ اس ولایت کا شملہ یا نینی تال یا کشمیر سمجھا جاتا ہی، کراچی سے یہاں تک جس شخص سے بغداد کا ذکر آتا ہی، مارے تعریف کے اُس کی زبان خشک ہوئی جاتی ہی، بغداد کا موسم یوں اچھا، میوسے یوں اچھے، پانی یوں اچھا، غرض کہ ہر چیز اچھی ہی اچھی ہی۔

اور صاف تو یوں ہی کہ جگہ تو سب یہ اچھی ہیں، مگر دس دن کا قرنطینہ خدا کسی کو اس مصیبت میں نہ ڈالے۔ اب مجھے بھی یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ میں دس دن کی قید (غنیمت تھا کہ قید بامشقت نہ تھی) بھگت چکا ہوں

پہنچائے گئے ع

زنداں کو چلے مچل مچل کر

مگر حق یہ ہی کہ ہمارا قید خانہ بُرا نہیں، اُس کے سامنے دریا کا منظر نہایت عمدہ ہی، اور رات دن کشتیوں کا تانتا بندھا رہتا ہی، یہاں گاڑی کا کام کشتی دیتی ہی، اس لیے کہ ہر وقت بادبانی، اور غیر بادبانی اور دخانی کشتیاں سامنے سے گزرتی ہیں، بعض یہودیوں کا جھُرمٹ اُن کشتیوں میں عود بجاتا اور عربی گانے جنھیں ہم خاک نہیں سمجھتے، گاتا سامنے سے گزرتا ہی اور عجب پُر لطف سین ہوتا ہی۔

قرنطینہ کا مکان سیکنڈ کلاس والوں کے لیے خاصے آرام کا ہی اور میں سوائے اس کے کہ تنہا ہوں، نہایت آرام سے ہوں، موسم بے انتہا پیارا ہی کھڑکی کے سامنے گلاب کا تختہ کھلا ہی اور مہک رہا ہی اور اگر یہ صحیح ہی کہ ع

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد

مگر یہ مچھر بخت، کس زور سے کاٹتا ہی، لکھنے میں مصروف ہونے کی وجہ سے ان کی بھنبھناہٹ کی آواز بھی تو نہیں سُنی ورنہ یہ تو خبردار کر کے کاٹتے ہیں) نباشد۔ کسے را باکسے (اے تیری ایسی کی تیسی، پسّو ہیں کہ قہر خدا کا، تمام کپڑوں کے اندر گھس گئے، اور مارے

اور کہیں کہ ہیں محمرہ سے آرہا ہوں، تو اُن پر کوئی قرنطینہ نہ ہوگا لیکن وقت یہ آن پڑی کہ محمرہ کے قرنطینہ کے افسروں نے کہا کہ اگر یہاں اُتریں گے تو پانچ دن قرنطینہ میں رہنا ہوگا؛ آخرکار یہ ہوا کہ پانچ جہاز کے ساتھ ساتھ چلا اور جب ایرانی سرحد سے نکل گئے تو ایک خالی مقام دیکھ کر چپکے سے جہاز کھڑا کیا گیا اور ہز آنرز کا "میٹ" میں سوار ہو گئے، اور باقی ہم سب یوں ہی حسرتاً سے دیکھتے رہے۔

محمرہ سے بصرہ صرف کوئی تیس پینتیس میل کے فاصلے پر ہے، اور ذرا آگے بڑھتے ہی بصرہ کے مضافات شروع ہو جاتے ہیں، دریا کے کنارے درختوں کے جھنڈ وہی ہیں، پھول وہی ہیں، مگر اب ان میں اُدھر لے بصرہ کے مکانات شروع ہو جاتے ہیں اور اُن قدرتی بے جان پھولوں میں انسانی زندہ پھول اور غنچے نظر آنے لگتے ہیں، یعنی حسین اور نہایت حسین یہودی۔ آرمینین اور خال خال ترک۔ عورتیں لڑکے اور لڑکیاں دوڑ دوڑ کے لبِ دریا ہمارے جہاز کو دیکھنے آتے ہیں، اور ہم دوڑ دوڑ کے ڈک کے کنارے اُن کو دیکھنے جاتے ہیں، کاش یہ سلسلہ نا ختنا ہی ہوتا، مگر وہ تو ایک دو گھنٹے ہی میں جہاز بصرہ پہونچ گیا، اور وہاں سے سرکاری کشتی میں بٹھا کر ہم سب قرنطینہ

ہیں اور یہ سلسلہ میں سنتا ہوں کہ یہاں سے بغداد تک یعنی چار سو میل تک قائم ہے۔ آپ کا جہاز ان سبز پوش سنتریوں کے بیچ ہیں فاؤ سے (جہاں سے یہ سلسلہ شروع ہوا ہے) بغداد تک جائے گا۔ شاید لوگ خرمے کے درختوں کی اس قدر تعریف سُن کر زیرِ لب مُسکرائیں گے؛ مگر یہ خیال رہے کہ یہ حجاز یا سوڈان کے خرمے کے درخت نہیں ہیں، کہ چار پانچ ایک جگہ کھڑے ہیں اور گرد سیکڑوں میل تک ریت کا چٹیل میدان ہے۔ یہ عراقین کے نخلستان اور خرماستاں ہیں، جن کے سایہ میں ہر قسم کے پھول اور پھل لگے ہوئے ہیں اور دماغ کو معطر کر رہے ہیں۔

دو بجے ہم محمّرہ پہنچے، یہ ایک چھوٹا سا مقام ہے، یہاں ایرانی سرحد ختم ہوئی ہے، اور یہاں سے دو طرفہ ساحلِ ٹرکی ہے۔

یہاں بھی وہی قرنطینہ! ''گولا'' پر برٹش سفارت کے ایک جج ہز آنر بٹیز ورتھ نگٹ قسطنطنیہ سے بغداد تشریف لے جا رہے تھے، جو جہاز ہندوستان سے آتا ہے، اُس کے مسافروں پر بصرہ میں ایک نہ دو، دس دن کا قرنطینہ ہوتا ہے۔ اس سے بچنے کے لیے یہ ترکیب کی گئی تھی کہ بغداد سے برٹش اسٹیم لانچ کا یسٹ محمّرہ بھیجدیا گیا تھا تاکہ وہ محمرہ سے اُس میں سوار ہو کے بصرہ جائیں

یہ مارے خوشی کے پاگل کر دینے والا منظر سامنے ہی. اور میں حقیقت میں تھوڑی دیر کے لئے پاگل ہو گیا تھا۔ جہاز پر دوڑا دوڑا پھرتا ہوں، کبھی اس طرف کے منظر کو دیکھتا ہوں اور کبھی اُس طرف کے۔

معلوم ہوا کہ ہمارا سفینہ سمندر چھوڑ کے دجلہ اور فرات کے مجموعہ پانی کے سینہ پر چل رہا ہی اور ایک طرف ساحلِ ترکی ہی اور دوسری طرف ایرانی۔ دجلہ اور فرات کے نام سے میں عرض نہیں کر سکتا کہ میرے دل پر کیا اثر کیا۔ آہ! تو اب ہم اُن دریاؤں پر ہیں، جو اسلامی تاریخ، اسلامی فسانہ، اسلامی ادب، اسلامی شاعری کے ہر صفحے پر موجزن ہیں۔

دجلہ و فرات! دجلہ و فرات!! تو یوں کہئے کہ یہ ان منظروں میں سے گزرتے ہیں! اور ان ساحلوں کو سیراب کرتے ہیں۔ میں نے سوائے کشمیر کے کہیں کسی دریا کا کنارہ اتنی دور تک ایسا سرسبز و شاداب نہیں دیکھا، اور اصل تو یہ ہی کہ جہلم کا کنارہ شاداب ہی اور بہت شاداب ہی، آخر ملکِ کشمیر ہی، لیکن دو طرفہ میدان نظر آتا ہی، اگرچہ سرسبز میدان ہی، یہاں اس دریا کے کنارے سوائے گھنے، اونچے، اور سرسبز درختوں اور پھولوں کے آپ اور کچھ نہیں دیکھ سکتے ہیں اوپر آسمان ہی، نیچے پانی ہی، اور دائیں بائیں نظر کو یہ درخت روک رہے

ہو گئے۔ مسقط کے بعد بوشہر تک سمندر ذرا خراب تھا، مگر میری طبیعت پھر بھی خراب نہیں ہوئی، ۸ اپریل کو ۹ بجے صبح بوشہر پہنچے، یہاں بھی اُترنے کی اجازت نہیں، دُوربین ہی سے شہر کو دیکھا، اور کچھ اچھا نہ پایا، (سنا ہے۔ بوشہر کے انگور کھٹے ہوتے ہیں)

مگر میں سمجھتا ہوں کہ آدھا بوشہر تو ہمارے جہاز کے گرد ہی آگیا تھا، ایک صاحب مجسم قرنطینہ پھرتے تھے یعنی اُن کی ٹوپی پر نہایت جلی قلم سے لکھا ہوا تھا "قرنطینہ"، جس کے نیچے ایرانی نشان یعنی شیر آگے کے پنجے میں شمشیر لیے کھڑا تھا، مگر صرف ایک کمی تھی، وہ یہ کہ خود "قرنطینہ" صاحب کی صورت ڈراؤنی نہ تھی۔ پھر بھی میں اُن سے ہمیشہ دس قدم کے فاصلے پر رہا۔ چار بجے شام کو انھیں بھی خیرباد کہا۔

۹- اپریل ۷ بجے صبح، سبحان اللہ، سبحان اللہ۔ ہم کس خطے میں جا رہے ہیں، رات ہی بھر میں یہ کیا طلسم ہو گیا، جہاز کی دونوں جانب کیسا دلکش منظر ہے۔ دو طرفہ خرمے کے درختوں کی مسلسل قطاریں ہیں، اور اُن کے پیچھے اور نیچے گلاب اور نارنگی اور انار کے درخت ہیں، جو پھول اور پھل سے لدے ہوئے ہیں اور جہاں تک نگاہ دُوربین کے ذریعے سے کام کرتی ہے،

نہایت خوشگوار تھا، اور سمندر کی جبیں پر ذرا بھی بل نہ تھا، اور اگرچہ یہ میرا پہلا سمندر کا سفر تھا، لیکن میں نہیں جانتا کہ سر گرانی، اور طبیعت کا متلانا کسے کہتے ہیں۔ اور اگر سفرِ بحر ایسا ہی ہمیشہ ہوتا ہی، تو میں عمر بھر سفر کرنے کو طیار ہوں۔ لیکن لوگ کہتے ہیں مئی، جون میں خلیج فارس کا فراج برہم ہوتا ہی اور اُس وقت وہ کسی کی نہیں سُنتے۔

۵۔ اپریل کو ۲ بجے سہ پہر کے قریب مسقط پہنچے، اس مقام کو دیکھکر طبیعت نہایت مکدّر ہوئی۔ پہاڑ ہی پہاڑ ہیں، جن پر درخت کیسا، سوکھی گھاس کے ایک پتّے تک کا نشان نہیں، اور اُس پر حاکم مسقط کو دعوئے سلطانی ہی، میری رائے میں اگر وہ اپنے تئیں مالک وزر مسقط کہیں تو نہایت مناسب ہی۔ شہر مسقط پہاڑوں سے گھرا ہی اور خود پہاڑ کی ڈھال پر واقع ہی۔ اور دُور سے تو خوش نما معلوم ہوتا ہی، پکّے اور کئی منزل کے مکان ہیں، جو سمندر کے کنارے تک چلے آئے ہیں۔ کراچی میں سردی تھی، اور آگے چل کر تو مجھے پوری پوری سردی ملی، مگر یہاں خیر سے ابھی سے وسط مئی کا لطف آ رہا تھا۔

میں نے چاہا کہ اُتر کے شہر دیکھ آؤں مگر قرنطینہ کے ڈاکٹر نے کسی کو اجازت نہ دی، اور ہم مسقط کو دُور ہی سے ڈنڈوت کرکے ۶ بجے شام کو روانہ

کی طرزِ معاشرت رسم و رواج، طریق بود و باش کے حالات سے دلچسپی رکھتے ہیں، تو بھی میں نے بہت کم دیکھا ہے، اگر آپ کو مختلف ممالک کی طرزِ حکومت و طریقۂ سیاست میں شغف ہے، تو پھر میں عرض کروں گا کہ میں نے ابھی کچھ نہیں دیکھا، مگر ہاں اگر آپ قدرت کے مناظر سے دلچسپی رکھتے ہیں، تو میں نے بہت کچھ دیکھا ہے، میں نے دل رُبا سین اور جاں فزا مناظر دیکھے ہیں، لیکن بیان کرنے کی طاقت نہیں، لہذا خود ہی لطف اُٹھاتا ہوں۔

۲۶ مارچ ۱۹۰۸ء کو اپنے پیارے دوستوں سے، کچھ ارمان بھرے اور زیادہ تر حرمان بھرے دل کے ساتھ جدا ہوا، اور دوستوں نے جس عنایت اور محبت سے مجھے خیر باد کہا ہے، اُس کے شکریہ کے بجائے شکایت کو دل چاہتا ہے، کیوں کہ اُس نے جدائی کے قلق کو اور صد گونہ کر دیا۔

کراچی پہنچتے پہنچتے مجھے احباب اور اعزا کی کشش کئی اور شہروں میں بھی لے گئی ؎

چلا میں وادیِ الفت میں راہ سوزن کی
قدم قدم پہ مجھے ڈوبنے کو چاہ ملے

آخرکار ۳ اپریل کو جہاز "کولا" پر کراچی سے روانہ ہو گیا، موسم

سفرِ بغداد

سنہ ۱۹۰۴ء

(کراچی تا بصرہ)

میں یہ نہ بتاؤں گا کہ میں کب، اور کیوں، اور کہاں سے روانہ ہوا، کیوں کہ میرے دوست ان تمام باتوں سے واقف ہیں، اور جو مجھے نہیں جانتے اُنھیں بتانے کی ضرورت نہیں، صرف اتنا کہدینا کافی ہی کہ بغداد تک جا رہا ہوں، اور آج کل بصرہ کے اُس خوش سواد زندان میں جسے عرفِ عام میں قرنطینہ کہتے ہیں، ہندوستان سے آنے کے جُرم میں دس دن کی قید بھگت رہا ہوں۔

میں نے کیا دیکھا؟ اگر آپ تاریخی مقامات اور عمارات اور کھنڈروں کی تحقیقات کے عاشق ہیں، تو میں نے کچھ بھی نہیں دیکھا، اگر آپ قوموں

اُردو کا نیا شاعر: اقبالؔ[1]

(سنہ ۱۹۰۳ء)

ہمیں خوشی اور کشادہ دلی سے ماننا چاہیے، کہ اردو کو ایک نیا شاعر ملا ہی، جس کی آواز ہر روز لطیف تر، جس کا نغمہ ہر آن شیریں تر، اور جس کا تخیل ہر لمحہ بلند تر ہوتا جاتا ہی۔ یہ تنگ دلی، یہ بچوں کا سا رشک، یہ اک شخص کی خداداد قابلیت کے اعتراف سے اِبا کیوں ہی؟ اگر اک عندلیبِ خوش نوا دفعتہً اور بغتتہً، کسی شاخِ گل پر بیٹھ کر ایسی جاں آویز اور دل گداز نغمہ سنجی شروع کر دیتی ہی، جو اور عنادل میں نہیں، تو میں خیال کرتا ہوں (میں صرف خیال کرتا ہوں، کیونکہ میں عندلیب نہیں، کاش میں مرغِ خوش الحان نہیں، تو مرغِ ساکت ہی ہوتا، تاکہ اپنے موجودہ ہم جنس انسانوں کی تنگ دلی کا نظارہ نہ دیکھتا!) کہ اور ہم صفیرانِ چمن اُس نغمے کو سنتے ہیں، اور اس نئے ہم صفیر کا دلی مسرت سے خیر مقدم کرتے ہیں، مگر ہمارے باغِ سخن کے نوآموز عنادل کسی نو عمر عندلیب کا ایسا نغمہ جو اُن کے نغمے (؟) سے بدرجہا بالاتر ہو، بغیر رشک کے نہیں سُن سکتے! تعجب ہی اور افسوس!

---

[1] سنہ ۱۹۲۶ء ترجمانِ حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال مدظلہٗ۔

احساسات

رقیب کو جو دو دن قبل ذلّت نصیب ہوئی جمیلہ نے اس کا حال سُنایا۔ اُس کے عجیب اطوار اس کی لایعنی انگریزی سے گڈ مڈ گفتار نے شیخ صاحب کو اسقدر مغلوبِ غضب کر دیا تھا کہ اُنھوں نے اُسے اپنے سامنے سے نکال دیا تھا۔

۱۲۔ جولائی ۔شب

آج رات میں دیر سے گھر لوٹا، تو جمیلہ کا ایک خط مجھے مِلا۔ میں نے دھڑکتے دل سے اُسے کھولا اور پڑھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا تھا۔ میں نے خط کو دوبارہ پڑھا۔ تو یہ صحیح تھا کہ جمیلہ اب میری تھی؟ شیخ امراللہ نے اس کا فیصلہ کر لیا تھا اور بیوی کو بھی اطلاع دے دی تھی۔

پیاری جمیلہ کا خط جو ایسی بڑی بشارت میرے لیے لایا، میری کامیابی کے راز کو اس طرح بیان کر رہا ہے

میں اپنے منہ پر ہاتھ رکھے کہ کہیں آواز نہ نکل جائے کواڑ کی دراز میں کان لگائے سن رہی تھی۔ ابّا جان بڑی بی سے تمھارے متعلق یہ کہہ رہے تھے، حاذق ڈاکٹر ہے، اور پھر الحمدللہ پکّا، سچّا مسلمان، وہ دوسرا تو بے دین ملحد ہے اور یہ اس کی طرح دو ٹوک بات نہیں کہدیتا اُمید ہے، بڑی بی، امید ہے جب تک سانس ہے تب تک آس ہے۔

شیخ صاحب نے اور بہت سے سوالات مجھ سے کیے، یعنی جمیلہ نے جیسا لکھا تھا اُنھوں نے طرح طرح سے میری تحقیقات کی، ایک گھنٹہ سے زیادہ زیرِ جرح رہا۔ اس کے بعد میں نے نسخہ لکھا، اور دوا کے متعلق ہدایتیں کیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آج کا دن جو شیخ صاحب کی خدمت میں گذرا وہ میری زندگی کے خوش ترین، پُر نشہ ترین دنوں میں سے تھا، میرے خسر، بلا شک و شبہ، بالکل لٹو ہیں۔

۴ - جولائی

میں کل پھر مریضہ کو دیکھنے گیا تھا، بیچاری بڑھیا کچھ ہوش میں تھی، باتیں بھی کرتی تھی، کچھ مسکرائی بھی، شیخ امراللہ کی باچھیں خوشی سے کھلی جاتی تھیں مجھے دیکھتے ہی فرمانے لگے۔

"عزیز من! عزیز من! محض تمہاری کوشش سے اس کی حالت سنبھلی"

میں نے بطور رد کے جواب دیا۔

آپ کیا فرما رہے ہیں، توبہ کیجیے، توبہ کیجیے، ھذا من فضل ربی لطف الٰہی لُطفِ ربّانی۔"

شیخ صاحب نے میرے معروضہ کی تصدیق فرمائی، مسکرائے اور نظر سامنے کو گاڑ دی۔ واپسی میں جمیلہ سے میری باتیں ہوئیں، صاف دل اور بھولے

آج بازار جاکر، اک ریشمی ڈورے اور ریشمی پھندنے کی، نہایت خوبصورت تسبیح خرید کر لاؤں گا۔

۵- جولائی شام

میں شیخ امراللہ سے ملاقات کرکے ابھی آیا ہوں، اپنے پیارے قابل عزت خسر سے مجھے شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ بڑی دیر تک لطف و عنایت فرمائی۔ ہنس مکھ چہرے سے میرا استقبال کیا۔ مریضہ کے کمرے میں مجھے خود لے گئے۔ مریضہ کا معائنہ کرنے کے بعد، ہم دونوں کمرے سے باہر آئے تو مجھ میں اور شیخ صاحب میں یہ گفتگو ہوئی،

"عزیز من، کہو مریضہ کی کیا کیفیت ہے"

"شکر ہے خدا کا، شکر"

"بالکل نا امیدی تو نہیں، کیوں"؟

"(سر جھکا کر) اللہ بہتر جانتا ہے، انسان کچھ نہیں کہہ سکتا"

"تو کیا وہ مسافرِ دارِ آخرت ہے، آپکا یہ مطلب ہے"؟

"لا واللہ - مع ذلک المقدر لا یغیر۔

"قطعی یاس تو نہیں"؟

"انشاءاللہ الرحمٰن"

اور اٹل اعتقاد رکھنے والے ہیں جس بیماری کا انہوں نے ذکر کیا ہے وہ معمولی بیماری ہے اُس کی مصیبت تو ہم ایک مہینے سے جھیل رہے ہیں یہ تو ایک بہانہ ہی کہ تمہیں دیکھ کے، تم سے جرح کر کے تمہارے متعلق رائے قائم کیجائے کہ تمہیں دامادی میں لیں یا نہ لیں، تمہارے رقیب کا میں نے تم سے اُس دن ذکر کیا تھا۔ ابا جان کا اُس کے نام بھی خط گیا ہے۔ وہ بھی آئے گا مگر اُس آدمی کو جس نے اپنی سی سالہ زندگی سختی میں، اور اپنی جوانی تمہاری طرح پیرس و لندن جیسے دیارِ عشرت میں نہیں بلکہ یہاں ریاضت و عبادت میں گذاری ہے، جانتے ہو، میں نے کیا خبر بھجوائی ہے؟ ابا جان کے سامنے خوب تیار ہو کے آئیں، ابا جان اگرچہ مولوی ہیں مگر مغربیت و نئی روشنی کی بڑی قدر کرتے ہیں اُن سے باتیں کریں تو ٹھونس ٹھونس کے، جا و بیجا انگریزی فقروں اور لفظوں کا استعمال کریں۔ اگر مجھے حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس کا صرف ایک ذریعہ ہے کہ اس ملاقات میں حتی الامکان فیشن ایبل اور آزاد خیال بنیں''۔

وفا شعار، مہربان و نوازش کار، جمیلہ کا میں کس طرح شکریہ ادا کروں اس خط کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ میری اور اس کی خوب گذرے گی۔

سے بالکل واقف نہیں تو انہوں نے دونوں کو فوراً خط لکھے، جن میں دو دو دن کے فاصلے سے اُن سے ملاقات کرنے کے لیے وقت مقرر کیے خط ڈاک میں ڈال دیئے گئے۔

۳- جولائی صبح

آج صبح چٹھی رساں مجھے دو خط دے گیا، میں نے دونوں کو کھولا اور پڑھا۔ اللہ! میں کیسا خوش قسمت ہوں، ایک پر پیاری جمیلہ کے، اور دوسرے پر اُس کے باپ کے دستخط تھے۔

شیخ امر اللہ کے خط کا مطلب یہ ہے:-

اُن کے گھر میں کوئی یکایک بیمار ہو گیا ہے، جب کہ میں اُن کا فرزند بننے کے لیے تیار ہوں تو انہیں مناسب نہیں معلوم ہوا کہ مجھے چھوڑ کے وہ کسی اور ڈاکٹر کو بُلائیں، لہذا مجھے ہدایت ہوئی ہے کہ از راہِ سعادتمندی میں دوشنبہ ۵- جولائی کو تکلیف کر کے اُن کے گھر آؤں

حالانکہ جمیلہ کا پیارا خط کچھ اور ہی کہہ رہا ہے! "میرے سامنے جو تم مذہب کے متعلق واہی تباہی بکا کرتے ہو، خبردار، ابا جان کے سامنے وہ فضول بکواس مت کرنا تم جانتے ہو ابا جان مذہب کے معاملے میں

آخر ایک دن شیخ امراللہ کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ ایک مہینے سے اُن کے گھر میں، خدا کی بھیجی ہوئی ایک مہمان بڑھیا ٹھیری ہوئی تھی۔ یہ ایک بے یار و مددگار ضعیفہ تھی، جو نہ معلوم کہاں سے گھسٹتی گھسٹتی اُن کے دروازے تک آئی تھی اور اُنہوں نے اپنے ہاں اُسے ٹھیرالیا تھا مگر بیچاری بڑھیا جس دن سے آئی اُس دن سے بیمار جو پڑی، تو آج تک بیمار تھی، بخار میں پھک رہی تھی، اور اب اُس میں بستر سے اُٹھنے کی بھی طاقت نہ رہی تھی سب گھر والے پریشان و متفکر تھے۔ ہر روز اُس کے مُنہ میں غذا و دوا چُواتے تھے، اور بستر پاک کرتے تھے اِس بیمار کو اک طبیبِ حاذق کی ضرورت تھی۔ شیخ امراللہ ایسے خسیس و سنگدل نہ تھے کہ اُس ضعیفہ کے علاج میں جس نے اُن کی چھت کے نیچے آکر پناہ لی تھی، ہر ممکن کوشش و صرف سے دریغ کرتے لیکن یہ موقع بھی اچھا موقع تھا۔ اُن کی جوان لڑکی کے طالب ڈو ڈاکٹر تھے اُنہیں ہی بلانا چاہیئے، اُن سے باتیں کرنی چاہئیں، اُن کے خیالات و افکار کی تحقیق کرنی چاہیئے اور ان میں سے جو بہتر معلوم ہو، جمیلہ کو اُسے سونپنا چاہیئے اس تجویز کا اُنہوں نے اپنی بیوی کے سوا، اور کسی سے ذکر نہیں کیا، بیوی نے جب اُن کی رائے سے اس طرح اتفاق کیا۔ گویا وہ ان میں سے کسی

دیکھی تھی۔ حیران تھے، کسے انتخاب کریں، کسے اپنی بیٹی دیں۔ فال اور استخارے دیکھتے۔ سب سے زیادہ فکر اُنہیں اُن کے اخلاق و عادات کے متعلق تھی اُن کی بیٹی کے طالب، کیا طبیعت، کیسے خیالات رکھتے تھے؟ اگر اُن کا اعتقاد سست اور مزاج غیر متین ہوا، تو اُن سے گذارا مشکل ہوگا۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ اُن کا داماد، ایک قوی ایمان کا مالک ہو۔ پابندِ صوم وصلوٰۃ، واقف اصول و فروغ دین ہو، فقرا و ضعفا کا بہت خیال کرتا ہو، نرم دل ہو، اگر وہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکیں کہ وہ امورِ دین سے واقف، اور ان پر عامل ہے، تو کم سے کم دو شاہدِ عادل سے تو سُن چکے ہوں۔ اس کی تحقیق بغیر تو وہ اپنی چہیتی بیٹی کو دینے سے رہے۔ کیا وہ اپنے لختِ جگر کو اپنے گھر سے دھکا دیکر گلی میں پھینک دینگے؟

مگر اس کی تحقیق کس طرح کریں۔ دونوں لڑکوں میں سے کسی سے واقف نہیں تلاش پر بھی کوئی ایسا قابلِ اعتماد آدمی نہ ملا جو اُن کے صحیح صحیح حالات بتا سکے برخلاف اس کے اُن کے کانوں میں تو یہ خبریں پہنچی تھیں کہ اُن میں سے ایک تو ایسا ہے جس نے عمر بھر میں ایک دفعہ بھی خدا کو سجدہ نہیں کیا، بلکہ وہ ایک فرنگ مآب فلسفی ہے۔

داماد کا انتخاب

شیخ امر اللہ کا سارا وقت عبادت اور اَوراد و وظائف میں گزرتا تھا
دوستوں عزیزوں کے بچے، بڑھ کر جوان ہو گئے۔ اُنھوں نے نہ کبھی ان کی
شکل دیکھی اور نہ انھیں پہچانا۔ گھر کے انتظام سے وہ بے خبر، آنے جانے
والوں سے وہ لاعلم۔ لیکن شیخ صاحب ایک ہفتہ سے بہت شش و پنج میں
تھے، اُن کی پیاری بیٹی جمیلہ کے دو طالب پیدا ہوئے تھے۔ اور دونوں اتفاق
سے ڈاکٹر، دونوں کے پیام لانے والے شیخ امر اللہ کے راستہ کا چھ سات
دن سے ناتا بانا کر رہے تھے۔ خوشامدیں کر کر کے اُن سے وعدہ لینا چاہتے
تھے۔ ایک کہتا تھا، "لڑکا آپ کی جمیلہ کا دل و جان سے طالب ہے" دوسرا
کہتا تھا، "لڑکے کے مُنہ میں ہفتہ بھر سے کھیل اُڑ کر نہیں گئی ہے، کہتا ہے اگر جمیلہ
نہ ملی تو نہ کھاؤں گا، نہ پیوں گا، خودکشی کر لوں گا"۔ شیخ امر اللہ کے لیے دونوں
بھول تھے، دونوں اگرچہ اُس کے عزیز تھے لیکن اُن کے عادات و اطوار
سے واقف ہونا تو علیحدہ رہا، اُنھوں نے ابھی تک کسی کی صورت تک نہیں

شادی بھی ہوجائے گی"!

میرے دوست نے اپنی داستان ختم کرکے اک عمیق آہِ سرد کھینچی اور خاموش ہوگیا، اس سکوت میں اک ایسی یاسِ عظیم کی جھلک نظر آتی تھی کہ مجھے خوف ہوا کہیں نظمیؔ اس نا امیدی کی وجہ سے کوئی دیوانگی کی حرکت نہ کر بیٹھے۔

از دواج بڑھائے تو وہ بدبخت ہوگی، اس لیے مری نصیحت ہے کہ آپ کسی ایسی عورت سے شادی کیجئے جو آپ کے قابل ہو" پھر یکایک طرزِ کلام بدل کر اور نہایت سنجیدہ اور عزم کار ہو کر کہنے لگی "ہاں، اور میری یہ عرض بھی سُن لیجئے، اس کے بعد اس قسم کی باتوں کا ذکر نہ کیجئے گا، اگر آپ میرے دوست رہنا چاہتے ہیں تو جس طرح پہلے ملا کرتے تھے اُسی طرح ملا کیجئے۔ ورنہ یقین کیجئے کہ بالکل آپ سے قطع تعلق کر لوں گی۔"

اس ضرب سے میری تمام قوتِ محاکمہ منجمد ہو کر رہ گئی، بالآخر میں نے اپنے تئیں سنبھالا اور کہا "لیکن نجمہ تم مجھے مار ڈالو گی، سوچو تو، میں تمہیں دیوانہ وار چاہتا ہوں۔"

وہ نہایت بے پروایانہ انداز سے اپنا شانہ ہلا کر بولی "لیکن میں تو تمہیں مطلق نہیں چاہتی۔" اتنا کہہ کر مجھے چھوڑ کے چلدی۔

اُس دن کے بعد سے میری اُس کی ملاقات نہیں ہوئی، وہ اب باسفورس پر رہتی ہیں اور میں یہاں اک ہوٹل میں پڑا سڑ رہا ہوں۔ ایک دن میرا اُس کا پُل پر مقابلہ ہو گیا۔ مجھے دیکھتے ہی اُس نے اپنا مُنہ پھیر لیا۔ سنتا ہوں اک کپتان کو نجمہ سے محبت ہو گئی ہے، اور تھوڑے دنوں میں اُن کی

ملاقاتیں، وعدے، سوگندیں، قسمیں، اس کے بعد رشک، ابتلا، وعدہ خلافیاں ظلم وستم، روٹھنا بگڑنا، پھر رنج والم انتظار و فراق، اس کے بعد، تغافل و تجاہل، غرضیکہ میدانِ اُلفت میں کبھی خوش کبھی متردد اور آخرکار نا اُمید و خطرناک قدموں سے ہم نے قطع ہم نے مسافت کی۔ اور نتیجہ وہی ہوا جو ہوتا ہی تحسر و ناکامی۔ اس گشت گذار میں ہم ایک ایسے مقام پر پہونچے کہ ایک قدم آگے ڈالنا ہمیں قعرِ ہلاکت میں لیجاتا۔ یہ اس قدر یقینی تھا پھر بھی پیچھے قدم ڈالنے کی میں اپنی میں قوت نہ پاتا تھا، وہ اُس تہلکہ سے۔ جس طرح اور اور مشکلات میں اور دوسرے موقعوں پر اُس نے کیا تھا اک سحر آمیز قہقہہ لگاتی ہوئی نکل گئی، اور اس کے بعد میری ہنسی اُڑا کر مجھے چھیڑا کرتی، اُس وقت مجھے معلوم ہوا کہ نجمہ مجھے چاہتی نہیں، نہ کبھی اُس نے مجھے چاہا تھا، بے شبہ اُس نے اپنے زخم خوردہ غرور کا انتقام مجھ سے لینا چاہا اور اس میں وہ کامیاب ہوئی۔ اسے میں نے اُس دن معلوم کیا جس دن میں نے اُس سے شادی کی درخواست کی، میں اُس سے اک ابدی رشتہ کی بحث کر رہا تھا، اور اُس نے اک بے الضاف قہقہے سے میری بات کو کاٹا اور کہا "اگر اک بدشکل عورت تم جیسے حسین آدمی کے لئے دستِ

کو چھو کر کہنے لگی: "اب بھی مَنے نہیں"۔ اس کے بعد بہ طریقِ سرزنش بولی" شریر جانتے ہو ناکہ چاہے جاتے ہو، اسی وجہ سے یہ نہ ناز ہے، کیوں ؟"

اس وقت میں بھی صبر نہ کر سکا:

"سنو نجمہ میں التجا کرتا ہوں، جاؤ، کیا پھر مجھے دھوکہ دینا چاہتی ہو؟"

وہ بگڑ کر:

"یعنی مجھے رَد کرتے ہو؟"

پھر اک تیز نظر میری آنکھوں میں ڈالکر۔

"بہت اچھا جاتی ہوں" یہ کہہ کے چلدی۔

میں اس مقابلہ میں مغلوب ہوا، اُس کے پیچھے دوڑا، اُس کے ہاتھ پکڑ کے پھر کھڑکی تک لایا، اور کہا:

"دیکھو تم نے جو کیا بڑی زیادتی ہے، مجھے تسخیر کر کے چلا جانا، کیا مجھے دیوانہ بنانا چاہتی ہو؟"

وہ اپنی غالبیت سے مطمئن و خاموش تھی، میں اُس کی مظفریت کے مقابلہ میں اک عاجز و حقیر صید کی طرح بندھا ہوا تھا۔

اس رات کے بعد ہم میں اک آتشیں دورۂ عشق شروع ہوا۔ سیریں۔

اک پری ہے۔ میں ایک عمیق لذّتِ تماشا سے اُسے دیکھ رہا تھا اور تعجب کر رہا تھا کہ کیوں اب تک میں نے اس کی طرف سے بے توجہی کی تھی۔ تو یوں کہیے نجمہ ایسی بدشکل عورت نہیں جو چاہی نہ جا سکے بلکہ حسین ہونے سے زیادہ اُس میں اک کشش تھی جو انسان کو مسخّر کر لیتی ہے اور جو ایسے بہت سے حسینوں کے مقابلہ میں جو انسان کی روح کو تسلّی نہ دیں اعلانِ ظفر کرتی ہے؛ اس کے چہرہ میں کوئی کمی نہ تھی، اس کی باریک سیاہ ابرو ئیں، گہری نیلی آنکھیں لمبے سیاہی مائل بال اُسے حسین کہلانے کے لئے کافی تھے، صرف اس کا دہانہ ذرا بڑا تھا، اور اس تمام خوبصورتی کو ناقص کرتا تھا مگر میں اس میں بھی کوئی فقدانِ مناسبت نہیں پاتا تھا بلکہ میرا خیال تھا کہ اس چہرہ میں اک چھوٹا دہانہ آہنگِ تناسب کے مغائر ہوتا۔ بہرحال ان تمام نقائص کے باوجود اس کی حالتِ روحی ایسی تھی کہ وہ مجھے حسین معلوم ہوئی، وہ میرے پاس آئی اور مٹھی میں چھپائے ہوئے ایک چیز میری طرف بڑھا کر کہنے لگی "لو تمہارے لئے مٹھائی لائی ہوں"

شکریہ عرض کرتا ہوں"

اس کے بعد کھڑکی تک آئی اور تھوڑی دیر تک سڑک پر سے گذرنے والوں کی سیر کرتی رہی، میں خاموش تھا، پھر اپنی سلیپر کی نوک سی میرے پاؤں

تعلقات ایسے بھی نہیں تھے جس سے معلوم ہو کہ صبح ہو گئی، ایک دوسری سے کبھی کبھی باتیں کرتے تھے لیکن ان میں حدِ تکلف برابر نمایاں رہتی تھی جس پر سے گذرنے کی قوت نہ پاتی تھے۔ اس وقت جبکہ ہر شخص اپنے کمرہ میں سونے کے لئے جا رہا ہے اُس کا اس غیر منتظر ملاقات کے لئے آنا ظاہر کرتا تھا کہ کوئی اہم مقصد ہے، اور یہ واقعہ اپنے پُراسرار ہونے پر دلالت کر رہا تھا، باوجود اس کے میں اس وقت ایک عجیب گھبراہٹ کے ساتھ اس خفیہ ملاقات سے بھاگنا چاہتا تھا۔ ایک منٹ کے بعد اُسے شب خوابی کے ہلکے لباس میں دیکھ کر میں حقیقتاً متحیر رہ گیا، وہ ہاتھ کمر پر رکھے ہوئے آہستہ آہستہ میری طرف آئی اُس کے ہونٹوں میں ایک معنی دار تبسم تھا، کہنے لگی "ابھی تک سوئے نہیں"۔

شروع میں میں کچھ سمجھا سا نہیں کہ اُس نے کیا کہا، میرا دل دھڑک رہا تھا اور اس کا سبب میں نہیں بتا سکتا، اُسے آدھی رات اپنے کمرہ میں تنہا دیکھ کر ایک عجیب حِس میرے قلب میں پیدا ہوا میں نے اب تک بجمہ کو اس حال میں نہ دیکھا تھا، اس کا سفید باریک لباس شبخوابی جس میں اس کے بازو پورے نہیں ڈھکے گئے تھے اپنے نیچے سے اُس کے خوبصورت جسم کو اس قدر نظر فریب طریقے سے دکھا رہا تھا کہ چاند کی روشنی میں معلوم ہوتا تھا کہ یہ نازنین عورت

نہیں چاہتا اور نہیں چاہ سکتا جس وقت میں یہ کہہ رہا تھا دروازہ آہستہ سے
ہلتا معلوم ہوا، اُس وقت اپنے خیالات کو خوب صاف صاف لکھ کر ایک خط
انتقام حاصل کرنے کی غرض سے اُسے سُنانے کے لیے میں نے خوب زور زور سے
کہنا شروع کیا "نجمہ بدشکل ہے، علاوہ ازیں میری اُس کی کبھی نبھ نہیں سکتی، نیز
مجھے ہرگز یقین نہیں کہ وہ مجھے چاہتی ہے باوجود اس کے میں نے اُس سے صلح
کر لینے کا وعدہ کیا۔ بڑھیا نے دُعائیں دیں "اللہ تمھاری جوانی قائم رکھے۔"

مگر ان تمام جھوٹ باتوں سے جنھیں میں نے شروع میں ذرا بھی اہمیت نہیں
دی میں اتنا مغلوب ہوا کہ اب تک اس مغلوبیت کی ذلّت اسارت سے نالاں
ہوں۔ آج اس دن کے واقعات کو یاد کر کے میرے دل میں اک وہ کیفیت
پیدا ہوتی ہے گویا اک خوابِ وصال اک طوفانی رات میں دیکھا گیا ہو:۔

اس دن ہم سب رات کا کھانا کھانے کے بعد گاڑیوں پر سوار ہو کر اک
لمبی ہوا خوری کو نکلے، گیارہ بجے کے قریب گھر لوٹے، کپڑے اُتارنے سے
پہلے میں اپنے کمرہ کی کھڑکی میں سے چاندنی کی سیر کر رہا تھا کہ مجھے معلوم ہوا کہ
کسی متردد ہاتھ نے نہایت آہستہ سے میرے دروازہ کو چھوا، اس خیال سے
کہ نجمہ ہو گی، میں بالکل خاموش رہا اگرچہ اب اُس سے بگاڑ نہیں تھا۔ لیکن

یہ اُس کی نسوانیت کی وہ احتیاجِ غرور تھی جسے وہ چھپا نہ سکی، ظاہر تھا کہ وہ اس کا تحمل نہ کر سکی کہ میں اُس کی پروانہ کروں۔ حالانکہ وہ مجھے چاہتی نہ تھی لیکن وہ اس کے لئے بیتاب تھی کہ میں اُس کی طرف لوٹ آؤں۔ میں اسے سمجھتا تھا، اور اُس کے اس تملّق کا جو بلی کی خرخراہٹ کی مانند تھا، ایک خاموش مقابلہ سے جواب دیتا تھا اور اس طرح اپنے نزدیک اُس سے انتقام لیتا تھا۔ وہ اس سے اس درجہ متاثر ہوتی تھی کہ لوگوں نے دیکھا کہ بعض دفعہ اُس نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا اور غصّہ کی وجہ سے پھُوٹ پھُوٹ کر رو دی۔ آخر ایک دن اُس کی اس حدّت و غصّہ سے اندیشہ میں پڑ کر ایک بڑھیا مجھ سے اس بگاڑ کو ختم کرنے کا وعدہ لینے کے لئے آئی اور اُس نے تمام تفصیلات مجھے بتائیں: نجمہ مجھے چاہتی ہے، اُس کے مقابلہ میں میرا اپنے تئیں اس قدر لاقید و بے پروا ظاہر کرنا بڑی غدّاری ہے، اگر میرا طرزِ عمل یہی رہا تو وہ ایک دن اپنے تئیں کُنوئیں میں گرا دے گی

بڑھیا اپنے ایک خاص مبالغۂ کلام کے ساتھ مجھے سمجھاتی تھی اور خود متاثر نظر آتی تھی لیکن میں بہت ضبط کرتا تھا کہ ہنسی میرے منہ سے نہ نکل جائے۔ نجمہ مجھے چاہتی ہے! میرے لئے کنوئیں میں گر پڑیگی! آہ بیچاری نجمہ! اگر میں اُسی

اس وقت نجمہ نے اپنی جھینپ ہنسی سے مٹانی چاہی اور میں نے بھی خیال کیا کہ اگر سلسلۂ گفتگو زیادہ رہا تو اور بھی زیادہ خلافِ تربیت باتیں ہونگی، وہاں سے چلد بنا ہی مناسب سمجھا، اس کے بعد میرے اور نجمہ کے درمیان ایک گہری خندق کھُد گئی، وہ مجھے دیکھتی تو مُنہ پھیر لیتی، میں اُسے دیکھتا تو اس طرح ظاہر کرتا گویا اُسے دیکھا ہی نہیں۔ میز پر کھانے پر جب ہم بیٹھتے تو اس خیال سے کہ ایک دوسرے پر نظر نہ پڑ جائے نظر میز ہی پر گاڑے رہتے۔ خاندان بھر میں ہماری اور نجمہ کی شکر رنجی نے لطیفہ کی شکل اختیار کر لی تھی، ہر شخص ہم سے اس کے متعلق ہنسی کرتا تھا، اگر ہم اتفاقاً کہیں ایک جگہ ہوتے تو ہمیں چھیڑا جاتا تھا۔

اسی طرح چار پانچ مہینہ کا عرصہ گذر گیا ایک دن عصر کے وقت میرا اور اس کا زینہ پر مقابلہ ہوگیا۔ یہاں سے ایک دوسرے کو چھوئے بغیر نکلنا ممکن نہ تھا میں نے خیال کیا کہ یہاں کوئی نیا جھگڑا شروع نہ ہو جائے اور اُس کی ایک تحقیر آمیز مُسکراہٹ اِس کے لئے کافی ہو سکتی تھی، میں نے اُس وقت اُس کی آنکھوں میں ایک مسکراہٹ دیکھی اور اُسے ایک مقدمہ استہزا سمجھ کر میں اُلٹا پھرا تاکہ ہدفِ استہزا نہ ہوں۔ وہ میرے پیچھے آئی اور کہنے لگی:۔

اب بھی ار وٹھے ہو بک آفندی! آؤ، اب صلح کرلیں۔"

آتی تھیں تو میں پھر اُن سے علیٰحدہ ہو جاتا اور ہر علیحدگی میں ایک ایسا جذبہ کیں
میرے دل میں پیدا ہوتا تھا کہ میں ہر دفعہ اس موقع کا متلاشی رہتا تھا کہ میں
بھی ان دو شخصوں کو جو ساری دنیا کی ہنسی اڑاتے ہیں ذلیل کروں۔ اکثر ہمارے
درمیان کوئی نہ کوئی بات ایسی پیش آجاتی جس سے ایک جھگڑے کی بنیاد
پڑ جاتی انھیں واقعات میں سے ایک واقعہ نے وہ شکل اختیار کی کہ آگے چل کر
وہی ایک سببِ انتقام ہو گیا اور تعلقات کو اُسی نے قطع کیا۔ ایک دن نہ
معلوم کس مناسبت سے۔ شاید مسئلۂ ذوق و حُسنِ طبیعت پر گفتگو تھی۔ گفتگو آہستہ آہستہ
شروع ہوئی مگر اُنہوں نے کہنا شروع کیا کہ میں ایک گاؤں کے گنوار سے زیادہ
نہیں ہوں، اور پھر اس گفتگو کا معنی دار مُسکراہٹ اور اشاروں اور اس کے بعد
قہقہوں سے تعاقب کیا، اُس وقت میں صبر نہ کر سکا اور اس تمام استخفاف
و استہزا کو ختم کرنے کے لئے غصّہ کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا اور وہاں سے گرجتا برستا
چلا گیا۔ وہ متحیر نظروں سے مجھے دیکھتے رہے، میں نے اُن کی تحقیر و تذلیل کا اس
طرح اعادہ کیا: "میں گنوار ہوں مانا تم سمجھتے ہو کہ تم بہت تربیت یافتہ مجلس آرا ہو
اور اس پر تمھیں بڑا غرور ہے مگر میرے نزدیک تو تم بے تمیز محلہ کے لڑکوں سے
زیادہ نہیں"

کے مادی فلسفوں اور اپنے گذشتہ خیالات کو بے بنیاد سمجھتا ہوں، ہاں اُس وقت میں یہ نہ سوچتا تھا، اُس وقت ناتجربہ کار تھا، اب کیا مجھ پر نہیں گذر گیا، کیسے تلخ تجربے ہوئے، اب سب باتوں پر یقین کرتا ہوں۔

یہ ایک سادہ مگر تھوڑی سی عجیب سرگذشت ہے کہ ابتدا میں محض ایک کامیڈی تھی لیکن رفتہ رفتہ اُس نے ایک غیر قابل اجتناب ٹریجڈی کی شکل اختیار کر لی۔ میں ابتدا ہی سے بیان کروں۔

میری اور نجمہ کی مناسبت اُس وقت سے شروع ہوئی جبکہ میں استبول پہونچا اس وقت ہم دو رشتہ داروں سے زیادہ نہ تھے جو ایک ہی گھر میں پل رہی ہوں، حتیٰ کہ ہماری ایک دوسرے سے بہت بنتی بھی نہ تھی۔ وہ ایک بد مزاج و مغرور لڑکی، میں ایک وقور و آتشیں نوجوان، گھر میں ایک چچا کا لڑکا تھا کہ اُسے سب سے زیادہ چاہتا، سب سے زیادہ اُس کی اطاعت کرتا، ہر وقت اُس کی خدمت میں حاضر رہتا اور جب گھر میں ہوتا تو اُس کی خدمت کرنا ہی اپنے لئے سب سے بڑا پُر لطف کام سمجھتا، کبھی کبھی میں بھی اُن سے جا ملتا مگر جب میں اُن آنکھوں پر نظر ڈالتا جو میری ہی نہیں بلکہ تمام انسانوں کی ہنسی اُڑاتی معلوم ہوتی تھیں اور میرے تمام حرکات کو ایک مضحکہ آمیز نگاہِ تنقید سے دیکھتی نظر

عورت کا انتقام

وہ کہہ رہا تھا" بھائی، تم کیا جانو یہ کس قدر المناک حقیقت ہے جس عورت کو چاہو اُس کی طرف سے تغافل دیکھو، یہی نہیں بلکہ اس کے بعد یہ بھی دیکھو کہ کسی دوسرے سے مشغول ہے، دوسرے پر اُس کی نگاہِ لطف وکرم ہے غرض اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے عشق کی تحقیر دیکھو اور اس ذلت کے مقابلہ میں کچھ نہ کر سکو اور مقہور وعاجز ہو کر اسی پر قانع نہ ہو کہ چاہے نہیں جاتی بلکہ یہ بھی محسوس کرو کہ کبھی چاہے نہ جاؤ گے، اُف، میں اُس مایوس عاشق کی طرح ہوں جس کے تمام رابطہ، مناسبات کو ایک ضربہ بیوفائی نے قطع کر دیا ہو جس کی اُمیدوں کا خون ہو گیا ہو اور جو یاس کی دیوانگی سے خودکشی کا تہیہ کر چکا ہو۔ ہاں، ایک مایوس عاشق..... یہ فقرہ جو تم نے میری زبان سے سُنا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ضرور تمھیں بیساختہ ہنسائے گا، مگر یہ اب ایک حقیقت ہے کہ اس کے مقابلہ میں میرے وہ پُرانے نظریئے ایک ایک کر کے ساقط ہو گئے اور اب چونکہ مجھ پر ہی یہ واقعات گذر رہے ہیں لہٰذا خود میں ہی اپنے سال بھر پہلے

"دشمن نے ہر طرف ہم کو گھیر لیا ہے۔ رشوت، بے ایمانی سے نظامِ سلطنت تباہ و برباد ہو گیا۔ ناقوس اور گھنٹوں کی آوازوں سے موذن کی آواز دب گئی۔ عباد اللہ کے مال و جان کی امنیت ضائع ہو گئی۔ خود والدہ سلطان پر بھی ظلم کیا جا رہا ہے۔ حضور آپ اس ملّت کی والدہ ہیں۔ آپ حقیقی معنوں میں ام المومنین ہیں۔ اسی لئے ہم آپ کے پاس فریاد لے کر آئے ہیں۔"

اس کے بعد سب نے یک زبان و یک دہان ہو کر کہنا شروع کیا کہ "شہزادے کو ہمیں دیجئیے اور للہ اس قوم کے نجات حاصل کرنے میں رکاوٹ نہ پیدا کیجئے۔"

کوسم سلطان نے محسوس کیا کہ اُس کا ضعیف جسم، اُس کے بیٹے کا اور سلطنت کا یگانہ محافظ ہے۔ کیا، اگر اُن کی خواہش پوری کرے، تو، یا اُنھیں لوٹا دے، تو اُس کے بیٹے کے نزدیک اُس کو اپنی پرانی قوت مل جائیگی؟ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ محلسرا کے غم آگین سکون میں اک خوف آمیز آواز سُنائی دی۔ ہما شاہ کی خزینہ دار، بزم عالم، کہہ رہی تھی، "خدا کے لئے، حضرت ملکہ ہما شاہ کو بچائیے!" اُس وقت کوسم سلطان جو اپنے بیٹے کے سقوط و تباہی کے مقابلے میں اک سدِّ آہنی کھڑی تھی۔ ہٹ گئی۔ اور اُس نے کہا:۔

"لو میں جاتی ہوں، شہزادے کو باندھ کر لاتی ہوں۔" اور اس ماں کا جس نے وقتِ ضرورت دستِ ملّت کو تخت اوندھا کرنے سے نہ روکا، عمیق صمیمی دعاؤں اور تحسین کے نعروں نے دلوان خانے تک تعاقب کیا۔

اور اور لوگ بھی باتوں میں دخل دینے لگے تھے۔ کبھی کوئی اکھڑ جاہل ینی چری کبھی کوئی باوقار مگر پُرجوش عالم شیخ الاسلام عزیز آفندی۔ باری باری سے کوسیم سلطان سے مباحثہ کرتے؛ مگر کبھی کسی کے ذہن میں اتنی جرأت کا خیال نہ پیدا ہوتا تھا کہ بارعب و معظم والدۂ سلطان کے آگے سے نکل جائے جاہل و عالم، افسر و سپاہی سب اُس کے سامنے اپنے سینوں پر ادب سے ہاتھ باندھے ہوئے اُس سے عرضِ حال کرتے تھے، اور اپنے حالات وخیالات کو سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ جماعت جو انقلاب و اختلال کے لئے نکلی تھی اُن کے حرکات میں اک وقار تھا جو مغربی ممالک کی انقلاب انگیز جماعتوں کی شدّت وہیجان کے مقابلے میں اُن کو ممیز کرتا تھا۔ آخر کار اک بے صبر آتشیں عمامہ پوش عالم جو ابھی اپنی جلاوطنی سے واپس آیا تھا حنفی آفندی۔ اس مباحثے میں داخل ہوا، اور اُس نے اپنی پوری قدرت استدلالی اور طلاقتِ لسانی سے اس بغاوت کے حق و عدالت پر مبنی ہونے کو ثابت کرنا شروع کیا۔ دیوان خانوں میں بھگدڑ پڑی ہوئی تھی، اور وہ اس بغاوت کے اسباب کو اک اک کرکے قطعی اور مکمل فقروں سے جتا رہا تھا۔ اُس کی آواز سے محل سرا کی غم آلودہ نیم تاریکی میں عکس صدا پیدا ہو رہا تھا۔

کو ندامت کے درجے تک لاکر وہ رُکا۔ اپنے چاروں طرف کے آدمیوں میں جو سکوت طاری تھا، اُسے دیکھکر متاثر ہوا اور اُس کے دل میں محبّتِ وطن و ملّت پھر جوش زن ہوئی اور پھر اُس نے حرارت آمیز طریقے سے گفتگو شروع کی اب اُس نے ملک کے اوپر جو کچھ گزر گیا، اک اک کر کے گنانا شروع کیا: دشمن سرحد سے گزر کر ملک میں داخل ہو چکا ہے؛ آبنائے میں اعدا کے فوجی جہازوں کا بیڑا پھیلا ہوا ہے" یہ کہتے کہتے اُس کے آواز کی نرماہٹ غائب ہوگئی اور وہ اک بڈھے شیر کی طرح گرجنے لگا" ملک میں بدامنی، ظلم پھیلا ہوا ہے، ناحق گلے کٹ رہے ہیں؛ بے گناہ سزائیں پا رہے ہیں؛ رعایا کو مال وجان کی امنیت نہیں،" یہ کہتے کہتے اُس کی آواز میں اک غمگین مگر دین دارانہ صمیمیت قلب کی رقت پیدا ہوئی، اور اُس نے کہا: "احکام شرع کی پابندی ہونی چاہئے"! والدۂ سلطان اپنی متانت کو قائم رکھے ہوئے تھی۔ کبھی اُن کو اب تک کے سکوت پر سرزنش کرتی تھی اور کبھی قطعی دلائل سے انھیں خاموش کرنا چاہتی تھی۔

مگر اب اس اژدہام میں بے صبری کی علامتیں نمودار ہونے لگیں۔ بھیڑ اک دوسرے کو ڈھکیلتی ہوئی آہستہ آہستہ اک اک قدم آگے ہوتی جاتی تھی،

زمیں پر گر گئیں مصلح الدین آغا کا سفید معزز سر جھک گیا اُس کے وفادار مگر مجبور چہرے پر اک سُرخی پھیل گئی۔ مراد آغا بھی جس کی آنکھیں لمبی سیاہ ابروؤں کے نیچے خوفناک چمک سے چمک رہی تھیں، خاموش ہو گیا۔

کوسم سلطان نے اُنکو اتنا موقع نہ دیا کہ وہ اپنے خیالات کو مجتمع کر سکیں، اور اک تیز مگر باردآواز سے کڑک کے کہا: "کیا تم بھول گئے کہ تم اس خاندانِ عالی کے پروردۂ احسان ہو؟"

اس فقرے نے وفا شعار مصلح الدین آغا کے دل پر نشتر کا کام کیا اس مستقیم بڈھے نے اپنی شخصی وفاداری کو ملت کی رفاہ وسعادت پر فدا کر دیا تھا؛ مگر وہ اپنی آنکھوں سے آنسوؤں کو نہ روک سکا، اور نم ناک آنکھوں سے اُس نے گفتگو شروع کی، اوّلاً اُس نے کانپتی ہوئی بڈھی آواز سے یہ کہا کہ اُن کی موجودہ حرکات میں شخصی منفعت کو ذرہ برابر بھی دخل نہیں۔ "میں خاندانِ شاہی کا نمک پروردہ ہوں اور میرا بال بال احسان سے جکڑا ہوا ہے۔ اک سُرخ پھٹی عبالے کر میں آیا تھا، اور اب اس مرتبے پر مراحم خسروانہ ہی کے طفیل میں پہنچا۔ کاش کہ میں یہ دن نہ دیکھتا!" یہ کہتے وقت اُس کی سفید ڈاڑھی سے رنج و ندامت کے آنسوؤں کے گرم قطرے ڈھلک رہے تھے۔ اپنے حسیات و جذبات

کوسم اپنے کمرے سے تیزی کے ساتھ باہر نکلی۔ اُس نے اپنے خواجہ سرا، ریحان کو اشارہ کیا اور اُسے ساتھ لے کر ایسی عظمت و وقار کے ساتھ جو بادشاہوں کی ماؤں کے شایاں ہے، آگے بڑھی۔ اُس کی طبیعت میں اگر قیامت بھی برپا ہو جاتی تو کوئی گھبراہٹ نہ پیدا ہوتی۔ اُس کے نازک کتابی چہرے اور سر کے اوپر اک سیاہ لمبی اوڑھنی پڑی تھی۔ اپنے حسیات کو اپنے چہرے میں چھپانے، لیکن دوسروں کی روح کی گہرائیوں تک پہنچ جانے کی کامل قدرت کے ساتھ وہ آگے بڑھی۔ اُس کے سُبک سیر فکر نے اک منٹ میں اپنے خطِ حرکت کو تعین کر لیا۔ وہ جانتی تھی کہ اس خوف ناک سیلابِ ملت کو قوم کے سر کردہ اکابر و اعیان کو وہی روک سکتی ہے اور اُس کی ہی عقل و ذکا ایسی ہے کہ اُن کے خطِ حرکت کو جس طرف چاہے موڑ دے۔ وہ آگے بڑھی۔ انسانی چہروں کا یہ سیلابِ عظیم جو اک دوسرے کو ڈھکیلتا ہوا حرم کی دہلیز کی طرف آ رہا تھا، اُس کی نظر محتشم کے سامنے تھوڑی دیر کے لئے رُک گیا۔ ان میں سفید ریش سے مزین چہرے، بھاری عماموں سے آراستہ سر تھے۔ یہ وہ مستحکم اور قوی آلہ ہائے انقلاب تھے جنھوں نے فاجعہ انگیز قدرت و یک دلی سے اپنے ارادے کو پورا کرنے کا تہیہ کر لیا تھا؛ مگر اُن کی آتشیں، محترص آنکھیں متردد و محجوب ہو کر

ہوگئی، وہ تُرک قوم جو بُردبار، صبور ہونے کے باوجود، آخر تنگ آکر کبھی کبھی اپنے حق کا مطالبہ کر ہی بیٹھتی ہے۔ کوسم سلطان باوجودیکہ اک شہری عورت تھی لیکن وہ عقل سے زیادہ حسِ فطری سے پہچان جاتی تھی کہ کون سی بغاوت اُس کے خلاف ہے اور کون سی شورش اُس کے حق میں۔ وہ جو ہر شے سے زیادہ اپنی عظمت کی دل دادہ تھی، اُس جوشش و غلیانِ ملی کو اپنی تیز ذکاوت سے اس طرح استعمال کرتی تھی کہ وہ ہمیشہ اُس کے عظمت و اقتدار کے بلند کرنے ہی کا اک آلہ ہو جاتے تھے۔ چاہے جوش قومی ہو یا محل سرا کی سازش، وہ ہمیشہ انھیں اپنے حق میں مفید طریقے سے استعمال کرتی تھی۔

شور میں زیادتی ہوئی۔ اب محل کے شہ نشینوں میں، دیوان خانوں میں، دالانوں میں، بھاگنے کی آوازیں آنے لگیں، دبی دبی چیخیں نکلنے لگیں، دروازے کھلنے لگے، بند ہونے لگے، زینوں پر بھاگڑ کی آواز آنے لگی۔ ہر طرف ڈرپوک طریقے سے سرگوشیاں ہونے لگیں۔ غرضکہ فضا میں اک پریشانی انگیز انتظار محسوس ہوتا تھا، کہ آخر کار اک بڑے خوفناک دھماکے سے محلِ شاہی کا بڑا پھاٹک پیچھے گرتا ہوا سُنائی دیا۔ اُس کے بعد دیکھا گیا کہ سیڑھیوں سے انسانوں کا اک اژدہام جو غصّے سے پاگل ہو رہا تھا، اوپر چڑھ رہا ہے۔

سامنے اک ذلیل غلام بن کر رہ گیا تھا۔ کاش تھوڑے وقت کے لئے بھی حکومت اُس کے ہاتھ میں ہو، تو یہ جو ہنس کے انداز سے جواہرات سے لدی ہوئی، گردن پھرا رہی ہے اُسے کس طرح اک چمڑے کی رسی سے کھنچوائیگی! وہ حسین، مرمر کی طرح سفید شانوں پر لہراتے ہوئے بال جس نے اسے طرحدار لونڈی کا لقب دیا ہے، وہ زلفِ زرتار کس طرح کیچڑ میں گھسٹوائے گی! غضب خدا کا، ملک کی یہ حقیقی ملکہ، بادشاہوں کی والدہ، ان لہراتے ہوئے زرد بالوں، ان نیلی نشیلی آنکھوں کے حکم سے قریب تھا کہ جلا وطن کردی جائے!

وہ شور آہستہ آہستہ محلِ شاہی کے قریب ہوتا آرہا تھا۔ تھوڑی دیر میں شاید دس ہزار دلوں سے ضربۂ بغاوت کی دہشت ناک آواز محل سرا کی دریچوں کے نیچے سے بلند ہوئی۔ غیر منظم قدموں کی آوازیں، ہتیاروں کی جھنکاریں تہدید آمیز شکایتیں سُنائی دے رہی تھیں، گویا اک موج شکایت تھی جو انسانوں کے سمندر سے اُٹھ رہی تھی جس طرح لڑائی کا گھوڑا جسے لڑائی کی تعلیم دی گئی ہو دھاوے کے بگل کی آواز کو سُن کر اپنی تمام قوتِ اشتیاق کے ساتھ ہنہنا کر جواب دیتا ہے، کوسم کا تمام جسم بھی اک پُر شوق ہیجان سے کانپ رہا تھا۔ وہ ان نشانیوں سے خوب واقف تھی۔ ترک قوم کی طُغیان و غلیان میں، وہ قوم کے ساتھ شریک

کے مقابلہ میں جس نے اک برس کے اندر اس قدر قدرت و اقتدار حاصل کر لیا تھا، اس کا دل نفرت و حسد سے لبریز تھا۔

یہ لونڈی، اور اس لونڈی کی خواہشیں! یہ دلبر مخلوق جو شہزادیوں سے خدمت لے رہی تھی مگر جو اپنی تمام دلربائی و فسوں گری کے باوجود عقل و ذکا سے کس قدر بے بہرہ و عاری تھی!

جس طرح شہد کی مکھیوں کا چھتا شہد سے خالی کر دیا جائے تو مکھیاں اک شدید بھنبھناہٹ کے ساتھ غصہ سے وہاں سے روانہ ہوتی ہیں، کوسم سلطان کو دور سے اک ایسی آواز سنائی دی تھی، جو محلِ سلطانی کے آہستہ آہستہ قریب ہوتی جاتی تھی۔ ہماشاہ جس کا لقب طرحدار لونڈی پڑ گیا تھا، اس آواز کو نہیں سن رہی تھی، لیکن کوسم سلطان اس آواز کو سن کر اس سے اور بھی زیادہ نفرت کر رہی تھی یہ چرکس عنصر جو اس کا سراسر ضد تھا، یہ ہستیاں، جن کا سارا جادو ان کی گورے شانوں، ان کی ہیکل تمثال گردنوں، ان کے ریشمی بالوں میں پنہاں تھا!

کوسم سلطان اِک ایسی سریع اور تیز ذکاوت و عقلِ طبعی کی مالک تھی جس پر کوئی حِس یا جذبہ غلبہ نہ پا سکتا تھا، اور اس وجہ سے اپنے بیٹے، سلطان ابراہیم کو وہ ناقابلِ عفو خیال کرتی تھی جو ہماشاہ کے نرم اور گورے بازوؤں اور شانوں کے

تھا، بازاروں میں، سڑکوں پر اختلال تھا اور ملک سانس لینے کی بھی ہمت نہیں
کر سکتا تھا، لیکن اس بات کا منتظر تھا کہ کوئی مہم موقع پیدا ہو - ہر شخص اس
کے لئے چشم براہ تھا - اس انتظار میں کوسم سلطان بھی ملک کی شریک تھی - وہ
جانتی تھی کہ یہ آخری تجربہ قطعی طور پر زمام حکومت اس کے ہاتھ میں دے دیگا -
یہ عورت حکومت و قوت کو عزیز ترین خون سے زیادہ چاہتی تھی، اور اپنے بیٹے
کو بھی اقتدار و اختیار کے مقابلہ میں قربان کرنے کے لئے حاضر تھی -

نہیں، نہیں، حکومت و جبروت جس کی وہ اس قدر عادی ہو گئی تھی،
جس قدر انسان سانس لینے کا، اس میں گھر کی ایک لونڈی مداخلت کرے! یہ
ہماشاہ، یہ بنی سنوری لونڈی، جو سلطان ابراہیم کو اپنی چھوٹی انگلیوں پر نچا رہی تھی
جو اپنی نیلی فام آنکھوں کی لمبی نگاہوں سے ملک کے سب سے زیادہ قیمتی مقامات
کو دشمن کے ہاتھ میں بے پروایانہ طریقے سے سلطان سے دلوا رہی تھی جو اپنی
معمولی سے معمولی خواہش کے لئے نہایت مجنونانہ ذریعوں سے ایک عظیم الشان
سلطنت کو برباد کر رہی تھی - یہ چرکس لونڈی! اس بار دخون والی عورت،
یعنی کوسم سلطان، میں اس دوسری کے مقابلہ میں اس قدر طفلانہ تہوّر تھا
کہ وہ اپنے بیٹے کے قتل کرنے کے لئے حکم دینے سے نہیں جھجکی - اس لونڈی

آج وہ اپنے تئیں نہایت شدید بحران وہیجان میں پاتی ہے:۔ بیٹا اور سلطنت! مگر اُس کے دل کے باریک ترین تاروں میں، اُس کی ہستی کے پوشیدہ ترین عنصر میں، یہ نہ خیال کیجیے گا کہ کوئی معمولی، کوئی قدرتی آرزو پوشیدہ ہی۔ اُس کا مرحوم شوہر، اُس کا بیٹا، محل شاہی حتیٰ کہ ایک عظیم الشان مُلک و ملت اُس کی طاقت و قدرت کے زیادہ کرنے کے وسیلوں کے علاوہ اور کچھ نہ تھے. قدرتی طور پر اُسے جس چیز سے سب سے زیادہ مربوط ہونا چاہیے تھا، وہ ترک قوم تھی جس سے نکل کر وہ اس درجہ پر پہنچی تھی۔ وہ اس سے مربوط تھی، مگر یہ رابطہ کس قدر ہلکا، کس قدر نامحسوس تھا! تخت ٹکڑے ٹکڑے ہوئے، انقلابات سیاہی کا ظہور ہوا، خون کے دریا بہے، وہ متاثر نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ اُس کی بچّوں کی مصیبت بھری زندگی بھی اُسے ٹھیس لگائے بغیر گزر گئی۔ اب اُس نے معلوم کیا کہ خاندانِ شاہی کے معظم سلسلے میں کوئی رسّی انسان کو باندھ نہیں سکتی، ماں کا درجہ بھی یہاں ہیچ ہے۔ مگر اس دبدبہ و احتشام میں تنہا زندگی بسر کرنے والی عورت نے چاہا کہ اک سلطنت کے اوپر سلطنت قائم کرے، اور اس میں وہ کامیاب ہوئی۔

آج وزیرِ اعظم احمد پاشا قتل ہو چکا تھا، ینی چریوں کی بغاوت کا ظہور ہو چکا

سیاست میں، ملک کے امورِ داخلی و خارجی میں، ثروت و اقتصادیات میں، غرضکہ ہر شے میں نفوذ کرنا شروع کر دیا تھا۔

مگر اک دن اُس نے دیکھا کہ اُس کی فرماں روائی جسے وہ اب اپنا حق سمجھنے لگی تھی، اور اُس کا اثر، سب سرنگوں تھے، اور اور عورتیں اُس کی حکمرانی میں شریک تھیں۔ آج وہ دوسرے درجے پر تھی، شاید کسی درجے پر نہ تھی۔ کیا یہ ہی ہونا تھا؟

اور پھر اپنے ہی بیٹے کے سامنے، اور بیٹا بھی کون بیٹا، سلطان ابراہیم! محلسرا کے بھاری ریشم کے پردے ہوا سے خاموشی سے ہل رہے تھے۔ ان پردوں نے صدیوں سے، حشمت مآب سلاطین کے وقارِ حکمرانی کو گویا وہاں مس کیا تھا۔ وہ اُن کی ہم آہنگ ہو کر خاموشی سے اِدھر اُدھر پھر رہی تھی۔ اس کی کامدار پاپوش سے قالین کے اوپر کوئی آواز نہ نکلتی تھی۔ اُس کے اعضا سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک چیتا ہے جو حملہ کرنے سے پہلے خاموشی سے آمادۂ جست ہے اور فاصلے کو جانچتا ہے۔ اُس کی آنکھوں کی سُرخی زیادہ ہو گئی ہے، ہاتھ ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں، اُس کے ہونٹوں پر اک خوفناک اور بارد تبسم ہے، جو اُس کے شدتِ فکر کو ظاہر کر رہے ہیں۔

کا سا اثر ڈالا ہے، تو وہ وہاں نظر نہ آتا۔ اُس کی آنکھیں گہری، اور اثر ڈالنے والی تھیں، جن کو نہ اُس کے سن و سال، نہ اُس کی لمبی اور پرخطر واقعات سے مملو زندگی نے بگاڑ رکھا تھا۔ اُن آنکھوں سے ایسی تیز اور ضیا بار شعاعیں نکلتی تھیں جو اپنے مخاطب کے سب سے زیادہ پوشیدہ، سب سے زیادہ تاریک افکار کو روشنی میں لے آتی تھیں۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ اُس کی پلکوں سے چھن چھن کر جو روشنی نکل رہی ہے، اُس میں فتنہ و فساد یا مبہم ہوس و احتراص کا عنصر زیادہ ہے۔

غرضکہ وہ اپنی معظم و شاہانہ ہئیتِ مجموعی، اپنے باریک مگر حاکمانہ ابروؤں اور ارادہ و حیات پرور آنکھوں کی وجہ سے اک فقیر کے جھونپڑے سے نکل کر اس پُرشان و شوکت محلسرا میں پہنچی، اور وہاں پہنچکر اُس نے خاقانِ مرحوم کی روح کی گہرائیوں میں گھر کر لیا تھا، اور ایسا گھر کر لیا تھا کہ وہاں سے کسی کے نکالے نہ نکلی۔ اُن دیوان خانوں میں جن کے کونے کونے دلبر و دل رُبا کوہ قاف والیوں کے پُرعظمت ناز و ادا سے بھرے پڑے تھے، اُس نے پہنچکر زندگی کی چہل پہل کو ہزار گونا زیادہ کر دیا۔ وہ ہمیشہ اوپر جانے کی کوشش کرتی تھی، اور اپنی ذکا و فراست سے اُس نے صرف سب سے زیادہ محبوب اور سب سے زیادہ محترم ملکہ کا درجہ ہی حاصل نہیں کر لیا، بلکہ اُس کے اثر نے رفتہ رفتہ محلسرا سے نکل کے

کوسم سلطان

(تاریخِ عثمانی کا ایک ورق)

وہ اک شاہانہ کمرے میں رہتی تھی جس کا ساز و سامان جس کی مفروشات جس کے پردے قیمتی بھاری اور ریشمی تھے۔ وہ بہ نسبت صنعت کارانہ ہونے کے، زیادہ محتشم تھے۔ اس نظر فریب نمایش، اس رنگیں دبدبہ میں تنہا، سادہ جو ہستی نظر آتی تھی، وہ اس محلسرا کی حقیقی حاکمہ، تمام ملکِ عثمانی کی حقیقی ملکہ، کوسمِ سلطان تھی۔ وہ اک میانہ قد، نحیف و نازک عورت تھی۔ اُس کے پژمردہ، ضعیف مگر کتابی چہرے میں، اُس کے خشک رخساروں میں اُس کی اوڑھنی کے نیچے، نہایت احتیاط سے باندھے ہوئے گہرے رنگ کے بالوں میں، جن میں کہیں کہیں سفیدی آنی شروع ہوگئی تھی، اُس کی ستوان لمبی ناک میں جس کے نتھنے اکثر متحرک رہتے تھے، اُس کے باریک ہونٹوں میں، اگر کوئی یہ ڈھونڈھتا کہ مشرق کا وہ اسرار انگیز حسن و ادا نظر آئے، جس نے صدہا سال اپنے باریک پردوں سے عالمِ ادبیات میں لوگوں کے تخیل پر اک خواب

"کیا میری بھی داستانِ عشق نہ سنو گی؟" "نہیں نہیں! اب مجھ میں اور داستانِ عشق سننے کی طاقت نہیں!" میں گھبرا کر سیدھی زینے کی طرف بھاگی۔ میں اپنے خواب سے بیدار ہوئی۔ اسکندریہ کی فضائے روشن میں آفتاب کھڑکیوں سے گزر کر میرے بستر تک نور برسا رہا تھا۔

جو اک روما کی عورت کے آخری لمحوں کے شایانِ شان تھی،
کہا "بادشاہ سلامت کا حکم بجا لایا جائے گا" میں نے اپنے گھٹنوں پر
رکھکر اُس خط کی شاہانہ مہر کو توڑ کر کھولا، جسے دیکھتے ہی میرے
جسم کی حرارت یکایک برودت میں تبدیل ہو گئی۔ حکم تھا کہ یا تو اس
اندھے، بدشکل یونانی مسخرے کے ساتھ جو بادشاہ و ملکہ کی دربار
میں فیلسوفی و مسخرگی کرتا تھا، شادی کر دوں، ورنہ بصورت انحراف
پیالہ اس کے آخری قطرے تک پیوں۔ اوّل میرا دل اک ضربۂ
بغاوت سے دھڑکا۔ اس کے بعد اک دم میرے ذہن میں وہ
بہشت کے چند منٹ آئے جو اُس کے سر کو اپنے بازو پر رکھکر میں نے
گزارے تھے۔ میں نے اپنا ہاتھ پیالہ کی طرف بڑھایا اور اس آتشِ
محبت کو یاد کرکے میں نے تہیّہ کر لیا کہ موت، اور عدم اُس یاد
کو قائم و دائم رکھتی ہوئی مجھ تک پہنچے گی ...."

میں نے اپنا ہاتھ صندوق کے شیشہ کی طرف بڑھایا اور اُس کے بازو
کو شفقت سے ہاتھ لگایا، کہ اتنے میں اس شخص کی بیمار و خستہ آواز جسے
میں نے قسطنطنیۂ قدیم کا پوپ خیال کیا تھا یہ کہتی ہوئی سُنائی دی:۔

کو پہنچا رہے تھے میں پریشان و بیتاب تھی۔ اڈریان پر میری نظر پڑی تو میں نے دیکھا کہ غصّے سے اُس کی رگیں اُبھری ہوئی ہیں۔ آنکھوں میں بجلیاں کوندرہی ہیں۔ اُس ہاتھ کو جو اک حاکمانہ لباس میں ملبُس تھا اُس نے اُٹھایا اور دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ میں جیسے دبے پاؤں آئی تھی، ویسے ہی اُس سے نکلی اور ملکہ کے پاس جانا میرے خیال میں بھی نہ آیا۔ میں سیدھی اپنے کمرے میں گئی اور کپڑے اُتار کر مرمر کے اوپر اوندھی گر پڑی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ سرد سنگِ مرمر کیا، اسکندریہ کی مرطوب و سرد رات بھی میری حرارت سے گرم ہو گئی ہے۔ مجھے ہر لمحہ یہ انتظار تھا کہ بادشاہ کا کوئی سخت حکم آتا ہوگا! ضرور مجھے کوئی سخت سزا دی جائیگی۔ زیادہ وقت نہیں گزرا کہ چوبدار نے دروازہ کھولا۔ اُس کے ہاتھ میں اک چاندی کی کشتی تھی جس پر اک خط رکھا ہوا تھا اور اک سونے کا گلاس تھا جس میں اک سُرخ شربت بھرا ہوا تھا چوبدار نے کمالِ احترام سے سر جھکا کر مجھ سے یہ کہا "جہاں پناہ نے حکم دیا ہے کہ یہ خط لیجیے اور یہ شربت جس نے اس متانت سے

راستہ دے دیا۔

کمرے کی نیم تاریکی میں بادشاہ کی کوچ پر جس پر چیتے کی کھال بچھی ہوئی تھی، انٹونیو دراز تھا، اور اپنے حسین چہرے کو دلربایانہ انداز سے اپنے بازو پر رکھے ہوئے سو رہا تھا۔ اس وقت مجھے قطعی طور پر یہ محسوس ہوا کہ اپولو نے اس نوجوان کے جسم میں جنم لیا ہے۔ اِس مرمر کے خالی کمرے میں میں گھٹنوں کے بل آہستہ آہستہ چل کے نہایت خاموشی کے ساتھ اُس تک پہنچی۔ میرے بال، میرے پاؤں میں اُلجھتے تھے اور میرے چلنے میں مانع ہوتے تھے۔ آخر میں اُس تک پہنچ ہی گئی۔ میں نے اُس کے کندھے سے چادر اٹھائی اور اُس کے سر کو اُٹھا کے نہایت آہستہ سے اپنے بازو پر رکھا اور والہانہ نظروں سے اُسے دیکھا۔ یہ اتصال شاید ایک منٹ سے زیادہ نہ رہا ہوگا، مگر اس نے میرے جگر تک پہنچکر اک آتش سے مجھے جلا ڈالا، کہ اتنے میں سلامی کے لئے ہتھیاروں کا کھٹکا مجھے سُنائی دیا اور اس کے بعد بادشاہ کمرے میں داخل ہوا۔ میرا یہ حال تھا کہ میرے ہاتھ، اپنی تمام حسّاسیت کے ساتھ، اک آتشِ سیّال اُس کی جسم

برفانی مگر حسین شخص کو اپنی طرف کھینچنے کے لئے کیا کیا کچھ نہ کیا۔ میں نے اس عظمت کو جو روما کی عورتوں کے نزدیک سب سے زیادہ مقدس ہے پائمال کیا، لیکن وہ کبھی اک منٹ، اک سکنڈ کے لئے اپنی حسین آنکھوں کی تھکی ہوئی نظریں مجھ پر نہ ڈالتا تھا، مجھ سے بعد میں لوگوں نے کہا کہ وہ یونان کی اک بدشکل اور لنگڑی لڑکی پر عاشق ہے"

یہاں اس کی آواز بھرّائی تھی، مگر اس میں یاد ایّام کے ساتھ اشتیاق شامل تھا۔ کمرے میں اوروں کا مکالمہ جاری تھا، وہ کہے گئی:۔

"اک دن شہنشاہ بیگم نے مجھے شہنشاہ کے پاس کوئی بات دریافت کرنے کے لئے بھیجا، بادشاہ اکثر راتوں کو ستارہ بینی کیا کرتا تھا۔ دربان نے مجھ سے کہا کہ بادشاہ سلامت اس وقت رصدگاہ کی منارہ میں ہیں، اور اُن کے ساتھ اُن کا ندیم خاص انٹونیوس ہے؛ میرے دل میں اک خیال آیا جس کی لذّت نے مجھے مست کر دیا میں نے کہا "میرے ہاتھ میں اک کاغذ ہے، اور ملکہ کا حکم ہے کہ میں اس کاغذ کو بادشاہ کے ہاتھ میں خود پہنچاؤں"؛ دربان نے مجھے

سحر کے مقابلہ میں اپنا ثبات و متانت کھو بیٹھے تھے۔ اُن میں سے ہر ایک
اک اک کرکے، میرے حسن کی فتراک کا اسیر ہو گیا۔ دو ایک نے تو انتہائی
یاس میں خودکشی تک کر لی۔ ولی عہد انٹونیس کا یہ حال تھا کہ ہر وقت
نوکر کی طرح میری خدمت میں حاضر رہتا۔ شہنشاہ بیگم نے مجھ پر لطف و
نوازش کی بوچھار کر دی اور مجھے اپنی خاص معزز خواصوں کے زمرے
میں داخل کر لیا۔ آہ! کیا شان تھی، کیا شہرت تھی، کیا دبدبہ و طنطنہ
تھا، کیا دن تھے! اسکندریہ سے لیکر روما تک میرے حُسن کا آوازہ
پہنچ گیا تھا، لیکن ایک دن! اک دن شہنشاہ کے حضور میں میں
نے ایک نوجوان کو دیکھا۔ مجھے اس وقت معلوم ہوا کہ اپولو
دُنیا میں اُتر آیا ہے اور اس کی محبت کا شعلہ میرے دل میں
اس قدر بھڑکا کہ شہنشاہ اڈریان کی بندگی، جس نے اپنے تئیں
روما کے دیوتاؤں میں داخل کر دیا تھا، میں نے پس پشت ڈال
دی میرا تاجِ مظفریت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اک نوجوان کے
قدموں کے نیچے بکھرا ہوا پڑا تھا۔ اُس زمانے کی تصویر آپ
میں سے ایک شخص نے اپنی کتاب میں کھینچی ہے نا؟ میں نے اس

سو گئے تھے تو وہ کر کیا سکتے تھے؟ اس پُراسرار گفتگو کو وہ سمجھ سکتے تھے، اور اس میں کیا مداخلت کر سکتے تھے؟ اس تاریکی میں مجھے معلوم ہوا کہ کئی جسموں کو حرکت ہوئی؟ گفتگوئیں شروع ہوئیں، لمبی، گہری گفتگوئیں شروع ہوئیں۔ مجھے اک ہاتھ بڑے دروازے تک کھینچ لے گیا۔ میں اُس صندوق تک پہنچی جسے میں نو دن میں دیکھا تھا۔ میرے قدم وہاں گڑ گئے۔ صندوق میں اک حرکت پیدا ہوئی اُس میں سے اک آواز آہستہ آہستہ نکلی جو کہہ رہی تھی :-

"میرا نام لکریشیا ہے۔ شہنشاہ اڈریان کے زمانے میں اسکندریہ کا جو حاکم تھا، میں اس کی ہمشیر زادی ہوں۔ میں خوبصورت تھی ؟"

بیشک، میں اُس زمانہ کی سب سے زیادہ حسین عورت تھی۔ میرا ماموں مجھ سے کہا کرتا تھا کہ یہیں نہیں، روما میں بھی تو حسین عورتوں کی سردار ہوگی، مگر روما تک جانے کی ضرورت ہی نہ پیش آئی شہنشاہ اور شہنشاہ بیگم مع اپنے رفقا کے افریقہ کی سیاحت کو تشریف لائے ہم نے کیسی شاندار، گلریز، تخیل آفریں دعوتوں، ضیافتوں، کھیل تماشوں سے اُن کا استقبال کیا! یہ میرے لئے ایک بڑی کامیابی کی ابتدا تھی۔ روما کے وزیر زادے، امیر زادے میری آنکھوں کی

اُس کے دل کش چہرے میں اُس کی بڑی بڑی آنکھیں، اُس کے بھری ہوئے ہونٹ، اس کی ستواں ناک صاف بتا رہے تھے کہ وہ اک حسین عورت تھی۔ اُس کے سینہ کی شاہانہ گولائی، اُس کی اوڑھنی کے نیچے بگڑنا شروع ہوگئی تھی۔ صندوق کے شیشے پر ٹیک لگا کر میں دیر تک اس کے جسم کو دیکھتی رہی اور اس کے جسم کی ہیئتِ کذائی میں نفوذ کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ میری آنکھیں جو دیکھتے دیکھتے تھک گئی تھیں، انھیں ایسا معلوم ہوا کہ اس عمیق سکون میں اک حرکت پیدا ہوئی، اس کی بڑی بڑی آنکھوں نے اک دوستانہ تبسم سے مجھے دیکھا۔ مجھ سے کیا کہنا چاہتی ہے؟ کیا مجھے کسی طول طویل لطفِ مکالمہ کا نیوتہ دے رہی ہے؟

میں نہیں کہہ سکتی کہ یہ کیا تھا۔ کیا یہ اک خواب تھا؟ چاروں طرف تاریکی تھی۔ میں میوزیم کی چوڑے زینے سے جا رہی تھی کہ مجھے اس قدیم رومائی عورت نے بلایا اور میں اس کی طرف گئی۔ اگر مجھ سے کوئی پوچھتا کہ "تم کس سے ملنے جا رہی ہو؟" تو میں کیا کہوں گی؟ کیوں کہ میں اس کا نام بھی نہ جانتی تھی؛ مگر نہ معلوم کیوں، مجھ سے کسی نے کچھ سوال نہیں کیا۔ کیا اس بزمِ رفتگاں میں جب صحبتِ مکالمہ شروع ہوئی، تو میوزیم کے خدام سو گئے تھے؟ اور نہ بھی

جوڑے نے زندگی کے انتہائے انبساط اور مقصودِ الفت کو یہاں تک پہنچایا
تھا۔ اپنے شریک حیات، اپنے ثمرۂ حیات کے ساتھ، وہ یہاں لیٹے ہوئے تھے۔
ان کے اجزا ایک دوسرے سے مل رہے تھے اور ان ہڈیوں سی جو یہاں
خوابِ راحت میں تھیں، ان تین انسانوں کی ہڈیوں سے کچھ پوچھنے کی ضرورت
نہیں تھی۔ سب کچھ عیاں تھا۔ میں نے اپنا سر اُن کے سامنے خم کیا، اور میں آگے
بڑھ گئی۔ مُردوں میں بھی زندوں کی طرح شخصیت والے اور غیر شخصیت
والے ہوتے ہیں۔ مُردوں کے اس جمِ غفیر میں مجھے اک چہرہ نظر آیا جو اس
وقت بھی مضطرب تھا، جس کے اعصاب سے تشنج ہویدا، جس کی جبین پُرچین
جس کی آنکھوں میں اضطراب تھا۔ یہ بیزنیٹم (قسطنطنیۂ قدیم) کا اک پوپ تھا، شاید
اپنے بیمار اعصاب کو راحت پہنچانے کے لئے مصر کے بیابان و ریگستان میں
گھسٹتا گھسٹتا آیا ہوگا، موت میں بھی اس کی مریض روح، اس کی شکنوں کو نہ
ہٹا سکی۔ سب سے آخر میں نظر روما کی اک عورت کی مومیائی پر پڑی۔ اپنی
اوڑھنی کے نیچے، اُس کے چہرے کے بلیغ و معنی آفریں خطوط نہ معلوم کتنے
سو برس سے قائم تھے، اُس کے خوبصورت چھوٹے پاؤں کے ناخنوں پر
(شاید یہ اک نشانِ عالی خاندانی ہوگا) سونے کے خول چڑھے ہوئے تھے۔

اُن کی زینتیں، سب خیالی، وہمی چیزیں ہو سکتی ہیں، مگر یہ انسانی گوشت اور
ہڈیوں کے ٹکڑے! یہ، ہمارے گزشتہ کل والوں کے تمثالِ شخصی! وہ تصور
جو فنا کے خیال سے گریز کرتا ہے، اس کو دیکھ کر فرار کے دروازے اُس پر
بند ہو جاتے ہیں۔ ہمارا عجز، ہماری بیچارگی، برہنہ اور عریاں حالت میں، ہمارے
سامنے نظر آتی ہے۔ شفقت و ترحم آمیز حرمت کے ساتھ میں آگے بڑھی، اور میں نے
ہر صندوق کے اندر نظر ڈالی۔ اس نظر میں تجسس و حیرت نہ تھی۔ میری نظر باطنی
میں نفوذ کرنا ان بیچارے انسانوں کی ہڈیوں سے اپنا اک نقطۂ ارتباط پیدا کرنا چاہتی
تھی۔ پہلا صندوق اونچا اور چوڑا تھا۔ اُس میں تین مومیائیاں تھیں جن کے کپڑے
بوسیدہ ہو گئے تھے، گوشت خشک تھے۔ ہڈیاں بھی خاک ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ اک
بہت لمبا مرد اپنے دونوں بازو جسم سے ملائے ہوئے پڑا تھا۔ اس کے قریب ایک
عورت، مرد کے بازوؤں پر سر رکھے، اپنے سُرخ بال پھیلائے لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے
خشک چہرے میں گہری نیند اور خوشی کے علائم نمودار تھے۔ ان کے بعد،
مگر ان کے ہی پہلو میں، اک ننا منا سا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ میرے دل میں اس
مسرت و سعادتِ مجسم کے مقابلے میں تھوڑی سی رقت، مگر اس سے زیادہ حسد
پیدا ہوا۔ اپنے خوابِ مسرت کو تا ابد اپنی ہڈیوں کی راکھ میں لانے والے اس

انسان مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس کی پیشانی کے نیچے، دو ابروؤں کی تلواریں تھیں جو اُس مملکت کی (جو اپنی بادامی آنکھوں کے لئے دنیا میں مشہور ہے) دو بہترین بادامی آنکھوں پر سایہ افگن تھیں۔ یہ آنکھیں، یہ وہ بدیع و مستثنیٰ آنکھیں تھیں جن کی مثال دنیا نے دوسری دفعہ نہ دیکھی۔ میں انکی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی لیکن اتنا میں جانتی ہوں کہ اس کی آنکھوں میں اک آتش، اک حیاتِ سیاہ مشتعل تھی۔ یہ ضیاءِ مظلم یہ روشنی سیاہ اُس مہلک عشق کے اسرار احساسات کی نور پاشی کر رہی تھی جس نے اک نیاز آگیں، نوازش آئیں، سحر کار، مگر متکلم عورت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اس زریں اور متحرک چادر کے نیچے سے جو آفتاب کی سنہری شعاعوں نے بنا رکھی تھی، وہ اپنے بازو دعوت کار طریقے سے اُٹھا کر اپنی شیریں آواز سے کہہ رہی تھی:۔

"مارکس انٹونیس! میرے ہونٹوں میں ابدیت، میری آنکھوں میں جنت ہے"

ہم آخر میوزیم کے خاص ہال تک پہنچے۔ جو خدمتگار ہمیں سیر کرا رہا تھا، اُس نے بے پروایانہ طریقے سے چند شیشے کے بکسوں کو دکھا کر کہا "ان میں مومیائیاں ہیں"۔ یہ چیز جس کو کچھ اہمیت نہ دی گئی تھی، میری جنس کی حقیقی بقیہ یادگار تھی۔ اُس کے قریب پہنچتے ہی میں گویا زمین میں جکڑ دی گئی۔ یہ پتھر! اور

طلائی ذرہ ہائے خاک سے گزر کر آ رہا تھا۔ اس نے اک نورانی ستون کی شکل
اختیار کر لی تھی جس میں ذرّے اک نورِ متحرک بن کر رقص کر رہے تھے۔ میرا ذہن
دُنیا کے اُس بزرگ ترین ماجرائے عشق کی طرف منتقل ہوا، اور میں بہت دیر
تک عالمِ استغراق میں رہی۔ میری آنکھیں اُن ذرّاتِ ضیاء کے نورانی رقص
پر گڑی ہوئی تھیں، مگر وہاں سے مجھے موت نے نہیں، عشق نے لبیک کہا۔
روشنی کے اُن ذرّات میں ایک سفید و منور غبار نے ایک عورت کی شکل اختیار
کی جو کلیوپیٹرا کے حمام سے بلند ہو رہی تھی۔ اس نورِ جاری میں اک اثیری
شکلِ مبہم جسے چشمِ دل محسوس کرتی تھی۔ اُس کے سیاہ لہراتے ہوئے بال
اک سنہرے ریشمی فیتے میں بندھے ہوئے تھے۔ اُس کے عُریاں اور
حسین شانے نازک و خیانت کا رجحانات سے اوپر کی طرف مائل تھے۔ اس کا
عشوہ آفریں شباب، جس میں ایک صنعت کار کی روح نفوذ کئے ہوئے تھی،
ایک باریک قمیص سے اُس کے جسم کے تمام جادو، تمام قدرت بے اماں کو ظاہر
کر رہا تھا اس تصویر کو اُس منور ذروں کی چادر میں میں نے دیکھا۔ اس کے عارضِ گلگوں
جن میں ناقابلِ بیان نرماہٹ تھی جن میں نہایت دل کش خمدار خطوطِ تبسم پیدا
ہوتے تھے، اک سُرخ و سفید ٹھوڑی پر جا کر ختم ہوتے تھے۔ اِن کی کشش کا

تھے، سُرخ پردہ اٹھایا، اس کمرے میں خوبصورت عورتوں کے سنگین بت اک قطار میں کھڑے تھے۔ یہ زبانِ خاموشی سے مصروفِ مکالمہ تھیں۔ یہ شریف دلبر و دلربا قدیم روما کے حسین، اپنے بالوں کے نفیس تموّج، اپنے چہرے کی متکبرانہ نظر، اپنی جاکٹوں کی چھوٹی سے چھوٹی شکنوں میں. دو ہزار سال پہلے کے تقدم و عظمت کو اب تک قائم رکھے ہوئے تھے۔ ان کے بالوں کی سُرخی مائل کترن کو، اُن کی جاکٹوں کے چمکدار رنگوں کو صدیوں نے خراب نہ کیا تھا بلکہ اُن میں اک اور زیادہ صوفیانہ پن پیدا کر دیا تھا۔ ان پر اک شاندار اور شاہانہ سایہ پڑ رہا تھا۔ ہم نے جب یہ کہا کہ "یہ تو سارے میوزیم سے زیادہ قیمتی ہیں" تو خدمتگاروں نے معترضانہ و مغرورانہ انداز سے، اوپر کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ ان سے بھی زیادہ قیمتی چیزیں وہاں ہیں"۔ اک کمرے میں ایک محتشم، مدور مرمر کا حمام رکھا ہوا تھا جس کے گرد زنجیروں سے محافظت کے لیے احاطہ بنایا گیا تھا۔ میرے سوال پر "کلیوپیٹرا کا حمام" کہا گیا۔ اس فقرے پر میری روح کی گہرائیوں میں سے اک لرزش پیدا ہوئی ـ نیل گوں نیل، سبز خرما کی شاخوں اور حرارت آور فضا کی حقیقی ملکہ کتنے تاجدار سروں، کتنے شاہانہ دلوں، کتنی دیوانہ وار پرستشوں کی حاکمہ رہ چکی تھی! اس حمام کے اوپر گنبد کے شیشوں میں سے آفتاب کا نور

شہنشاہ! اڈریان پڑا ہوا ہے؛ اِدھر اپنے حسنِ سادی کی وجہ سے مغرور اور
اسی قدر انسانوں سے دُور، اک اپولو کھڑا ہے۔ اک ستون پر ایک موٹا تازہ
بچّہ اپنے ہاتھ پر سر رکھے سو رہا ہے۔ اک طرف اک مقدس برنجی بوگا انسانوں
کے ریوڑ کو اپنے نعلوں کے نیچے پیس رہا ہے، غرض کہ جوان، بڈھے، مرد،
عورت، دیوتا، اپنی خوبصورتی، اپنی بدصورتی کو لئے ہوئے، جس سے اُنھوں
نے دنیا کو اک رنگِ خاص دیا اور اپنی شہرت اور افسانوں اور روایتوں
سے زندگی کو منوّر کیا، سنگین بتوں میں کہیں بگڑے ہوئے ناراض چہرہ
لئے ہوئے، کہیں خوش و خنداں کھڑے تھے، کہیں کسی کمرے میں نفیس و نازک
زیوروں میں لدے ہوئے، سحّارانہ چمک رہے تھے۔ نہ معلوم انھوں نے
کن ہوسات، احتراصات میں گیان گزاری ہیں؛ نہ معلوم کس قدر عشق کی
سازشیں کی ہیں؛ نہ معلوم کن حسین آنکھوں کے سبب سے زیادہ جاذب تبسموں
کو اپنی طرف مائل کیا ہے؛ نہ معلوم کتنے اُن قدموں کو جنھوں نے راہِ راست
پر چلنے کا عزم بالجزم کر رکھا تھا، ڈگمگا دیا ہے۔

ہم اک کمرے میں داخل ہوئے جس کے سُنہری قبّے سے آفتاب کی طلائی
شعاعیں پڑ رہی تھیں۔ خدمتگاروں نے جو ہماری حیرت کے منتظر معلوم ہوتے

پوشیدہ ترین غرور، حساس ترین نقطۂ قلب کو خوش کرتا ہے۔ میرے قریب ماضی کی حسین شکلیں جو پتھر نے ہم تک پہنچائیں ٹوٹی پھوٹی پڑی تھیں۔ اُن کی زینتیں زندگی کے لوازمات کے متعلق اُن کی چھوٹی چھوٹی چیزیں پھیلی ہوئی تھیں، میں اُن میں پھر رہی تھی، مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس خاموش مقام میں، ان بے جان سنگین انسانوں کے ہونٹوں پر ایک تبسم تھا جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ تبسم اگر نوازش کا راز ہے، تو تھوڑا سا مستہزی بھی ہے، یعنی ماضی کے یہ انسان ہم نئے انسانوں پر اک خندۂ زیرِ لب سے نظر ڈال رہے تھے، یہ کیا سوچ رہے ہیں، یہ کیا کر رہے ہیں؟ "معنائے حیات، سرِ حیات جنھیں ہم نہ جان سکے، کیا یہ انھیں جانتے ہیں؟ اسے اُن سے پوچھنے، اُن سے سمجھنے کے لئے میرا کس قدر دل چاہتا ہے! مگر ساتھ ہی اس کے یہ بھی جانتی ہوں کہ اُن کی زندگیاں، خواہ ہیچ ہوں، خواہ اک نورِ صمدانی سے منور، کچھ بھی ہوں ان میں شریک ہونے کے لئے مطلقاً اُن جیسا ہونا پڑے گا۔ یہ بھی جانتی ہوں کہ وہ یہی کہیں گے کہ "ہم بھی اک وقت جب انسان تھے، تو تمھاری ہی طرح روئے ہنسے، عاشق ہوئے، نفرتیں کیں"! مگر کیسے پوچھوں؟

اُدھر خشمناک چہرے اور قہارانہ وجبارانہ انداز سے ہونٹ بنائے ہوئے

ہم جب مزاروں میں سے گزرتے ہیں، تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ انسانیت
جو نہ معلوم ابھی اور کتنی اونچی پرواز کرے گی، پر شکستہ ہوگئی۔ ہماری قابلیتِ
نمو سرِ تسلیم خم کئے ہوئے نظر آتی ہے۔ ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ فطرت جو ہر
چیز کو فنا کی مملکت میں لئے جارہی ہے، ہمیں بھی اپنے تاریک پروں میں لپیٹ
رہی ہے۔ اک دن، دس دن، ایک سال، دس سال، مختصر یہ کہ اک مدتِ
مدید بھی جس کے لئے ایک لمحہ ہے، وہ فطرت ہم کو عدم کی طرف گھسیٹے لئے
جارہی ہے۔ یہ حسِ میوزیم میں جاکے اور زیادہ قوت حاصل کرلیتا ہے۔ وہاں ہم کو
احساس ہوتا ہے کہ بشریت کے تمام مظاہر، اُن کی تجلیاتِ ظاہری و معنوی، اُن
کے عشق، اُن کی روح، اُن کی صنعت، غرض کہ اُن کی زندگی کے چھوٹے سے
چھوٹے نمونے جنھیں اُنھوں نے سنگ تراشی کے ذریعے قائم و دائم رکھنا چاہا،
وہ بھی دفن ہوجائیں گے۔ تنہا وہی نہیں، بلکہ اپنی ملت، اپنی تہذیب و مدنیت
کے ساتھ زیرِ زمین چلے جائینگے۔ نہ مرنے کے لئے انسان کی بھی کسقدر مصرانہ کسقدر
دردانگیز! کس قدر تمسخر آمیز کوششیں ہیں! ہمیں قبر اس خیال سے ڈراتی ہے
کہ ہم فنا ہوجائینگے لیکن: یہ ہمارے افکار و آثار کی زینت ہونگے اور دنیا
کوشش سے اور شوق سے انھیں قائم رکھے گی، یہ خیال ہمارے فکر و روح کے

بزمِ رفتگاں

(اسکندریہ کے میوزیم میں چند گھنٹے)

ہم سنگِ مرمر کے چوڑے زینے سے اوپر پہنچے ہی تھے کہ اک مرمریں شہ نشین ہمیں ملی۔ دن گرم تھا، چھت کے ٹھنڈے سایہ میں پہنچنے کے لئے ہمارے تیز قدم مرمر کے فرش پر جلد جلد پڑ رہے تھے جن کی وجہ سے فرش سے آواز نکل رہی تھی۔ یہ آوازیں جو اُن چوڑے دروازوں میں سے گزر کر جو اک دوسرے کے مقابل میں کھلے ہوئے تھے، وسیع کمروں میں عکسِ صدا پیدا کرتی تھیں اور ان آوازوں کی وجہ سے، اور ان سے زیادہ اُن کمروں میں دور خاموش مگر معنی دار عظمت کے ساتھ اُن آوازوں کو سننے والے سنگین بتوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہوا میں مُردوں کے سائے پھر رہے ہیں اور اس سے ہمارے اوپر اک مبہم خوف طاری ہوتا تھا۔ بالآخر ہم اُن کمروں میں پہنچے جہاں دن کی روشنی بھی مدھم ہو کر پہنچتی تھی، جہاں خاموشیٔ مطلق طاری تھی۔ یہاں ہم ماضی اور ماضی کے ساکنوں کے سامنے تھے۔

کہ تمہاری اک بہی خُواہ ہے جو افقہائے بعید سے تمہاری کوششوں، تمہاری کامیابیوں، تمہاری خوشیوں کو دیکھ رہی ہے، اور تمہارے لئے سعادتِ دین و دُنیا کے حصول کی دعا کر رہی ہے۔ کیا تم سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا؟
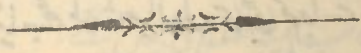
تمہارا کوئی ساتھ نہیں رہا تم نے مجھے اُس آدمی سے زیادہ پہچانا جس کے ساتھ میں نے تیرہ برس گزارے۔ کیا تمہارا ایمان نہیں ہے کہ مجھ سے ایسی حرکت سرزد نہیں ہو سکتی؟ میری سیاہ روح میں اب صرف یہی ایک منوّر نقطہ ہے۔ کہ جب ساری دنیا مجھے ملوث خیال کر رہی تھی تم جانتے تھے کہ میں بے گناہ و پاک ہوں۔ اک دن میری بیٹی بھی اسے جانے گی۔

تم سے میری اک آخری التجا اور ہے! اسے ایک بیاہی ہوئی عورت کی آخری آرزو سمجھ کر سنو؟ تم متاذی و مضطرب ہو کہ اس مصیبت کے سبب تم ہوئے جس نے مجھ پر وہ داغ لگایا جو اب دُھل نہیں سکتا اور جو مجھے دائمی جلاوطنی میں بھیج رہی ہے۔ مگر میری آرزو ہے کہ میرا نام تمہارے لئے اک عذاب اک تاسف نہ ہو۔ بس میں تم سے اس قدر آرزو رکھتی ہوں کہ جب تم میرا نام لو تو یہ خیال کرو کہ میں وہ ہوں جس نے جنسِ نسواں میں تمہیں اور تمہارے کلام کو سب سے بہتر سمجھا۔

یقین مانو کہ زندگی مصیبتوں میں کاٹنے پھر بھی زندہ رہنے کی ہمت مجھ میں صرف ایک وجہ سے ہے: میری لڑکی!

تاریخ تو مجھے کیا کچھ کہہ کر یاد کرے گی، مگر تم جب میرا خیال کرنا تو یہ خیال کرنا

میں اُسے سب حال بتاؤں گی۔ مگر تم سب مجھے پھر نہ دیکھو گے۔ میں ایک راز ایک معما بن کر غائب ہو جاؤں گی اور میرے لئے کسی کی آنکھ سے نہ ایک قطرہ آنسو کا نکلے گا، اور نہ کسی ہونٹ سے ایک کلمۂ افسوس۔ عزیز و اقربا جان پہچان والے سب ہمیشہ لعنت ہی بھیجیں گے۔

میں جنھیں پیچھے چھوڑ رہی ہوں، ان میں صرف تم ہی ہو جسے میری بے گناہی کا علم ہے مگر اس بے گناہی کو ثابت کرنے کا اقتدار نہیں ہیں اب بتانا چاہتی ہوں کہ میں نے یہ خط تمھیں کیوں لکھا۔ مگر تم سے التجا کرتی ہوں کہ اس خط کو تم کو مت دکھانا۔ کیوں کہ مجھے خوف ہے کہ جس بہتان پر سارا خاندان یقین کر رہا ہے۔ شاید وہ بھی یقین کرنے لگی ہو۔ میں اُسے معاف کرتی ہوں دیکھو، مجھے اس خیال سے تسلی ہوتی ہے کہ میری اکلوتی بہن کی زندگی کی خوشی تمھارے ہاتھ میں ہے۔ میری عزّتِ نفس قبول نہیں کرتی کہ تمھارے سوا اور کسی کو اپنی بے گناہی منوانے کے لئے کچھ لکھوں، مگر ہاں یہ حسرت ضرور اپنے ساتھ لئے جاتی ہوں کہ اگر میری طرف سے میری بہن کے دل میں غلط خیالات جاگزیں ہو گئے ہیں وہ دُور ہو جاتے۔

میں تمھیں یہ لکھ رہی ہوں کہ مجھے سمجھنے والے صرف تم ملے ہو تم کہ میرا

دے دیا۔ اب کون اسے روک سکتا ہے کہ تاریخ میں میرا نام اس طرح
درج ہو کہ یہ ننگ ناموس عورت تھی جس نے اپنی بہن کے ساتھ بے وفائی
کی۔ اگر ماجد یہ کہکر خودکشی کرتا کہ میں اپنے چچا کے بیٹے یا کسی اور کو چاہتی ہوں
تو بھی میں عمر بھر کے لئے رسوا اور بدنام ہوتی۔ مگر اب شاعرِ بے ہمتا رشید
کی سوانح عمری لکھنے والے لکھیں گے کہ اُس کی بیوی کی بہن نے اُس کے
ساتھ عشق کیا، اور اس بنا پر اس کے خاوند نے خودکشی کی۔ اسے ایک واقعہ
کا رنگ دیکر، بہت کچھ رنگ آمیزیاں کی جائیں گی۔ لوگ تمہیں معذور خیال
کریں گے مگر مجھے مسئول۔ الٰہی، میں نے کونسا ایسا گناہ کیا جس کی پاداش
میں ایسے خوف ناک افترا و بہتان پر بھینٹ چڑھائی جا رہی ہوں۔ مگر ایک
بے پروا اور میرا مضحکہ اُڑانے والا مقدر کہتا ہے کہ ہاں تجھ پر ہمیشہ یہ بہتان
تھپے گا۔ آہ! اب مجھ میں نہ اس کی جرأت نہ اس کی آرزو کہ میں لکھنؤ آؤں۔
میں اس سوسائٹی سے جو مجھے اُس گناہ پر جس کی میں مرتکب نہیں ہوں۔
ملعون قرار دیتی ہے میری زندگی کو برباد کرتی ہے، دور بھاگنا چاہتی ہوں۔
اپنی زندگی اپنی بدبخت بچّی کے ساتھ کسی نامعلوم گوشے میں جا کر بسر کروں گی
کسی کو خبر نہ ہوگی کہ میں کہاں چلی گئی۔ میری بچّی جب جوان ہوگی اُسوقت

اگلا گیا تھا یعنی یہ کہ میں جو اچانک لکھنؤ سے بھاگ آئی وہ اس لئے تھا کہ ماجد کو ہمارے تعلقات کی خبر نہ ہو جائے" اس خط نے تہمتوں کو اسی پر بس نہیں کیا۔ شادی کے آٹھ برس بعد تک میرے کوئی بچہ نہ ہونا' اور قمر کے بیاہ کے بعد میرے اولاد ہونا......... الٰہی توبہ! الٰہی توبہ' میں نہیں لکھ سکتی۔ یہ ملعون قلم' کیا کسی قاتل کے خنجر سے زیادہ کاٹ کرنے والا نہ تھا؟ ایک ایسے دماغ کے لئے جو مہینوں سے شبہات میں مبتلا تھا' کیا یہ دلائل کافی نہ تھے؟ تھوڑے ہی زمانے میں میری بدنامی پھیلی ہوگی۔ ہر شخص نے ماجد کے ساتھ ہمدردی کی۔ اُس کے جنازے پر سارا شہر آیا' اور ہر شخص نے مجھ پر لعنت کی۔

ماجد کی زندگی میں جیسا میرے ساتھ رہا سو رہا' مرتے وقت بھی میرے ساتھ بُرائی کر کے گیا۔ میرے ساتھ کسی نے وفا نہیں کی۔ مگر میں نے اپنی ہر حرکت اور ہر بات میں وفا کار و راست باز رہنے کی کوشش کی۔ اس کا عوض مجھے یہ ملا کہ جس شخص پر میں نے اپنی عمر کے بہترین تیرہ برس قربان کر دیئے اُس نے مجھ پر اعتبار نہ کیا اور تا ابد مجھے رسوا کیا۔ جو آدمی میرا اتنا محرم تھا' جب اُس نے ہی میری بات پر یقین نہ کیا اور اس حد تک یقین نہ کیا کہ اپنے سر میں گولی مار لی' تو اب اور کون یقین کریگا؟ اس خودکشی نے شبہ کو قطعیت' مطلقیت کا درجہ

بلند کیا تھا، اس وقت اس قدر مجروح تھی کہ عین اس لمحہ میں جب مجھ پر شڑاق شڑاق ہنٹر پڑ رہے تھے اور میری کھال ادھڑ رہی تھی، میں چاہتی تھی کہ اس مار کی تکلیف زیادہ ہو تاکہ میرے عزتِ نفس کے پامال ہونے کی تکلیف اس میں دب جائے۔

ماجد حیران تھا کہ وہ عورت جو معمولی دردِ سر کی تکلیف میں چیخ اٹھتی تھی کس عناد و تکبر کے ساتھ اس مار کو خاموشی سے سہ رہی تھی، اس نے اور زور سے مارنا شروع کیا: اس درد سے جو میرے شانے سے دوڑتا ہوا میرے قلب تک گیا، آخر کار بیتاب ہو کر میں بے ہوش ہو گئی اور نہ معلوم کتنی مدت تک میں اس حالت میں فرش پر پڑی رہی کہ میرے شانوں سے اور پیٹھ سے خون بہ رہا تھا۔ سکوتِ شب کو ریوالور کے چلنے کی سخت و قطعی دھماکے نے توڑا، اور میں نے آنکھیں کھولیں: ماجد سپاہی منش ہونے کی اس صفت کے ساتھ جس سے وہ ہمیشہ متصف رہا تھا۔ زمین پر پڑا ہوا تھا ریوالور کی گولی ایک کنپٹی سے دوسری کنپٹی میں نکل گئی تھی۔

اس کے بعد کا حال تمھیں معلوم ہو گیا ہو گا؟ ماجد کے ہاتھ میں ایک گمنام خط پایا گیا جس میں میرے اور تمھارے تعلقات کی نسبت بہت کچھ زہر

"اس حق سے کہ تم اپنی عصمت کھو بیٹھیں، اور انسانیت کے درجے سے نیچے گر گئیں۔"

میں نے غصہ سے چلا کر کہا: "جھوٹا، مفتری"

اس پر کیا یک ماجداک قدم پیچھے ہٹا، اور نرم آواز سے کہنے لگا:

"کیا تم قسم کھا سکتی ہو کہ رشید سے تمہارا کوئی تعلق نہیں؟"

اس کمینے سوال پر میں اپنے توازنِ طبیعت کو کھو بیٹھی۔ یہ بے اعتباری اس شخص کی طرف سے جس کے حق میں میں نے تیرہ برس کی طویل مدت میں کوئی چھوٹی سی چھوٹی ایسی حرکت نہیں کی جو بے وفائی کہلائی جا سکے، مجھے پاگل کئے دیتی تھی۔ میں نے جواب دیا:

"میں ہرگز قسم نہ کھاؤں گی جس عورت کو تم اس قدر رذیل سمجھتے ہو، اس سے بات ہی کیوں کرتے ہو؟ کہاں ہے تمہاری تلوار اور بندوق؟"

اُس نے کہا: "اب بھی غرور!" اور یہ کہکے اور ایک عجیب غراہٹ کی آواز گلے سے نکال کے اُس نے میرے سر کے بالوں کو پکڑا اور مجھے کھینچا، میں نے دیکھا کہ اُس نے ہنٹر کو اٹھایا: میں درد سے تو ڈرتی نہیں، مگر میری عزتِ نفس جسے بچپن سے میں نے بڑے اہتمام سے پالا پوسا تھا اور آسمان تک

رات آدھی گزری ہوگی۔ مجھے اک کرب سا محسوس ہوا اور میں جاگی۔ دیکھتی کیا ہوں کہ ماجد، جس کا چہرہ زرد ہے، آنکھیں انگاروں کی طرح سُرخ ہیں ہونٹ غصہ سے کانپ رہے ہیں، جھکا ہوا میرے چہرے کو دیکھ رہا ہے۔ اُس کے مُنہ سے شراب کی بھپک آرہی ہے۔ میں کانپتی ہوئی اُٹھ بیٹھی۔ ماجد جس نے کبھی شراب نہ پی تھی آج کیوں شراب میں دُھت تھا۔ وہ آج غیر معمولی طور پر خوش خوش گیا تھا، یکایک اُس میں ایسا تغیر کیوں ہوگیا۔ نہایت بُرے اور اکھڑ طریقے سے اُس نے ایک ہنٹر کو جسے وہ ایک ہاتھ میں لیے اور کمر پر رکھے ہوئے چھپائے ہوئے تھا اب دکھانا شروع کیا اور کہنے لگا: "میں لایا تھا بجلی کے لئے (بجلی، ایک بازاری عورت کا نام تھا جس کے ساتھ اُس نے بیاہ سے پہلے محبت کی تھی، یہ نام اب اُس نے اپنی چہیتی گھوڑی کو دے رکھا تھا) مگر یہ نصیب میں کسی اور کے تھا!"

میرا غرور سمٹ کر جمع ہوگیا، اور میں سیدھی ہو بیٹھی اور میں نے اُس آواز سے جس میں استخفاف اور جرأت دونوں ملی ہوئی تھیں پوچھا: "مجھے مارو گے"؟

"ہاں"

"کس حق سے؟"

نظر آرہا ہے۔ اگر تم ایک معمولی آدمی ہوتے تو اس تہمت کو جو اگر واقعیت بھی رکھتی ہوتی، مرورِ زمانہ بھلا دیتا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اگر کسی عورت کا نام کسی بڑے شاعر سے، جھوٹ یا سچ کسی طرح مربوط ہو جائے، وہ ادبیات کی تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ رہتا ہے۔ غرض کہ میں یہ خیال کر کے کانپ اُٹھتی تھی کہ باوجودیکہ میں بے گناہ ہوں آیندہ نسلیں مجھے اس ناپاک تہمت کے ساتھ یاد کریں گی۔ غالباً تمہاری یہ شاندار کامیابی، ناکام شاعروں کے شعلۂ حسد کو بھڑکائے گی، اور وہ تمہاری زندگی کو داغدار بنانے کے لیے ہمیشہ اس کا ذکر کریں گے۔ اور گھر کی یہ بے بنیاد بے سروپا باتیں، ان کے ہاتھ لگ کر تمہیں ملوث کرنے کے لئے شوق سے استعمال کی جائیں گی۔ بہت ممکن ہے کہ ماجد کے نام جو گمنام خطوط آئے، اُن کے لکھنے والے بھی دنی الطبع حاسد ہوں۔

میری بچی سو رہی تھی، میں نے اُس کے ریشمی بالوں پر اپنے ہونٹ رکھ کے حضورِ قلب کے ساتھ خدا کی درگاہ میں دیر تک دعا مانگی کہ وہ یہ اتہام میرے سر سے اُٹھالے۔ اُس رات، کلب میں ایک دعوت تھی۔ ماجد اُس میں گیا تھا اور یہ معلوم تھا کہ وہ دیر میں آئے گا۔ اس لیے میں سونے کے لیے لیٹ چکی تھی اور تھوڑی دیر بعد گہری نیند میں چلی گئی تھی۔

زہر جو نہ معلوم کہاں سے آرہا ہی میرے شوہر تک میں سرایت کررہا ہی، اور جب وہ تمہارا ذکر کرتا تو اُس کی نظریں بلتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ جو زمانہ تم کے گھر میں گزرتا، وہ بھی ان سرگوشیوں کی وجہ سے میرے لیے باعثِ تکلیف ہوتا۔ میرا وجدان مُتہم نہ تھا۔ لیکن میں چاہتی تھی کہ ان سرگوشیوں کا خود اُس سے ذکر نہ کروں، مجھے اطمینان تھا کہ میری جھیتی بہن میرے گلے میں باہیں ڈال کر مجھ سے کہے گی :۔

"میں آپ کے اور رشید کے متعلق ان باتوں کا کیسے یقین کرسکتی ہوں۔"

پچھلی دفعہ میں تین مہینے رہنے کے ارادے سے لکھنؤ گئی تھی، مگر صرف ڈیڑھ مہینہ رہی کیوں کہ تمہارے ہاں رہنے سے مجھے خوف آنے لگا ہی۔ میں اُس خوف سے بھاگتی ہوں جو بلا وجہ میرے سر پر پڑے۔

جس دن ماجد نے مجھ سے ان گمنام خطوں کا ذکر کیا تھا، اُسے دو ہفتے ہوچکے تھے۔ کہ میں نے رسالے میں تمہاری آخری نظم پر تنقید پڑھی ؛ جو سراپا مدحیانہ الفاظ میں تھی۔ تمہاری نظم کے ہزارہا نسخے بک رہے ہیں۔ تمہارے قلم سے وہ نظم نکلی تھی جس نے ایک شاندار مظفریت کے ساتھ تمہیں اقلیم سخن کا تاجدار بنا دیا۔ مگر مجھے اس نظم کی غیر معمولی کامیابی اور اپنی مصیبت میں ایک رابطہ

سے کہہ سکتے ہیں، ان حسیات میں جنس کا عنصر نہ تھا میری طرف سے اس کا خاص التزام رہا۔ میں کہہ سکتی ہوں کہ تمہارے مقابلہ میں میں اپنے چچازاد بھائی یا اپنے دیور سے زیادہ آزادی سے گفتگو کرتی تھی۔ میں نے اپنے دل سے پوچھا کہ میں تمہارے ساتھ اس قدر احتیاط کیوں برتتی ہوں۔ مجھے اس کا یقین تھا کہ تمہاری طرف میرے دل کی کوئی کمزوری نہ تھی۔ بھلا میں اس کی روادار ہوسکتی تھی کہ قمر کی آفتاب مسرت کی ضیا پاشی میں کسی ہلکے سے ہلکے بادل کا ٹکڑا بھی حائل ہو؟ میں زندگی کے ہر قدم پر دیکھ رہی تھی کہ دنیا میں کمیاب مگر محبوب ترین چیز "وفا" ہے۔ وہ قابلِ رشک زندگیاں جو ہر وقت ہالۂ مسرت میں نظر آتی تھیں، میں نے دیکھا کہ وہ اس عنصر وفا کے فقدان سے گہنا گئیں، مسرتیں غموں میں تبدیل ہوگئیں۔ انسانوں کے دماغوں میں داخل ہوکر اگر وہاں کے حالات کا کشف کرنا ممکن ہوتا تو دیکھا جاتا کہ وہاں کردہ و ناکردہ، متصور و متخیل کیا کیا بے وفائیاں، ستم آرائیاں چھپی بیٹھی ہیں۔ مگر میں دیکھ رہی تھی کہ ایک جاہل بڑھیا کی بے لگام زبان میرے متعلق سرگوشیاں کرانے لگی تھی۔ اُس نے مجھے اس قدر بزدل کردیا کہ اگر کوئی مجھ سے تمہارے متعلق ذکر کرتا، تو میں یہ خیال کرتی کہ وہ جان کر میری تحقیر کر رہا ہے۔ اور مجھے یہ گمان ہوتا تھا کہ یہ

مقدرات میں سے ہے۔

قمر میں کس قدر تغیر ہو گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک عالی روح، اور عالی فکر نے اپنی تمام خصوصیات اس میں القا کر دی تھیں اور عشق کے مو قلم نے اپنا رنگ اُس کے حسن، اُس کے فکر میں بھر دیا تھا۔ شام کو جس وقت تم اُسے اپنے اشعار یا اپنے مجوزہ تصانیف کے خاکے یا قصوں کے پلاٹ ...... سناتے تو وہ سمجھنے والی اور سمجھ کر داد دینے والی نظروں سے تمہیں دیکھتی، تم قمر میں سرتاپا حلول کر گئے تھے؛ تم بھی قمر کی ہر حرکت کو مشفق و مدقق نظر سے دیکھتے تھے۔ میں متبسمانہ اپنے دل میں ماجد کا خیال کیے بغیر نہ رہ سکتی تھی۔ وہ مجھ سے کہا کرتا تھا۔ "میں تمہارے زلف عنبریں کے ایک ٹوٹے ہوئے بال کے بدلے میں تمہارے سارے افکار و اشعار کو نہ لوں۔"

حال آنکہ تم نے قمر کے تنویر دماغ کے لئے اُس کے معمولی بالوں کی پروا نہیں کی۔ اس کے بعد مجھ میں اور تم میں ایک رابطۂ دوستی شروع ہو گیا۔ اس دوستی کی اس خصوصیت میں کبھی فرق نہ آیا کہ وہ اتحادِ خیالات کی دوستی تھی میں نے اپنے تخیلات و حسیات کی دنیا میں تمہیں اپنا شریک پایا۔ مگر یہ تخیلات و حسیات وہ تھے جو دو مرد ایک دوسرے کے متعلق رکھ سکتے ہیں یا ایک دوسرے

رہی کہ تم اُسے کتنا چاہتے ہو۔ میں نے اس محبت کو محسوس کیا، ایک صمیمی، عمیق وو فاکار شفقت! تم میری چھوٹی قمر کے آرام کے لیے، اپنی شخصیت کو بالکل برطرف کر دیتے ہو۔

اب جو تم گھر میں آئے، تو شاید صبح کی گفتگوؤں کا نتیجہ تھا یا کیا، میں بلا ارادہ، اپنے دل میں اپنی زندگی اور ماجد کا تم سے مقابلہ کرنے لگی۔ مجھے نظر آیا کہ گو ماجد بھی مجھے دیوانہ وار چاہتا ہے مگر اُس کی محبت مادّی ہے۔ تمہارا عشق قمر کے ساتھ ایک حمایہ کار، شفاف محبت کی شان لیے ہوئے ہے۔ ان دونوں محبتوں میں مجھے وہ فرق نظر آیا، جو دوزخ اور بہشت میں ہے۔ تم قمر کو اُس کی آرزو کے خلاف گھونٹتے نہیں زرا زرا سی باتوں پر ستاتے نہیں، ساتھ ہی اس کے تمہاری محبت میں ماجد کا سا طوفان، جوش و خروش یا مردانہ ستانہ پن نہیں ہے۔ ممکن ہے اس بات پر، قمر کی سکون حیات و مسرت منور پر مجھے تھوڑا سا غبطہ ہوا ہو، مگر مجھے اس کی خوشی سے اتنی خوشی ہوتی ہے کہ میں کہہ سکتی ہوں نہیں ہوا۔ میری زندگی کے لیے تو شاید یہ مقدرات میں سے ہے کہ ہمیشہ وہ طوفان میں سے گزرے۔ مجھے ایسا سکون ملتا جیسا تمہارے گھر میں ہے، یقیناً وہاں بھی طوفان شروع ہو جاتا۔ جیسا میں نے ابھی کہا، یہ میرے

نصیبے میں لکھا تھا جسے پڑھنے لکھنے یا شعروشاعری کا ذرا بھی شوق نہیں۔ تم جو بچپن سے کتابوں کا کیڑا رہی ہو، تمہیں ایک پولیس والا ہی جیسے کودپھاند کے سوا اور کچھ نہیں آتا۔"

"میں اپنے اکھڑ پولیس والے سے خوش ہوں؛ مجھے شاعر نہیں چاہیئے۔"

"خدا تمہیں خوش رکھے بیٹی؛ مگر رشید صاحب کی نزاکت و نفاستِ مزاج ایسی ہی کہ اُسے چاہے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ وہ ہر وقت اپنی بیوی کی دلجوئی کا خیال رکھتا ہی۔"

"یہ مانا میرا پولیس مین ایسا نہیں، مگر قمر کی خوش بختی میری خوش بختی ہی۔"

بی مغلانی، میرے دل میں حسد پیدا کرنے کی ناکامیابی سے کچھ کھسیانی سی ہو کر رہ گئیں۔ تھوڑی دیر بعد قمر اپنا حسین مگر بھولا چہرہ لیے آئی۔ اُس کی آنکھوں سے، نورِ مسرت کی شعاعیں نکل رہی تھیں جسے دیکھ کر میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ بی مغلانی کی کوششوں کے باوجود میں اور قمر ایک دوسرے کو اتنا چاہتے ہیں، ایک دوسرے کو اتنا سمجھتے ہیں کہ ایک دوسرے کی خوشی و رنج میں پوری طرح شریک ہوتے ہیں۔ اُس دن قمر مجھے سُناتی

اور دوستی کے حدود سے سرمو تجاوز نہیں کیا گیا، اور تمہاری نگاہوں میں میں نے کبھی اخوت کی شفافیت کے سوا کوئی اور جھلک دیکھی ہی نہیں۔

مگر کیوں اس وقت، سب سے پہلے میرے ذہن میں تمہارا نام آیا؟ میں پچھلی دفعہ جب لکھنؤ میں تھی تو میں نے اعزا و احبا کی نظروں اور اطوار میں کچھ عجیب و غریب اشارے پائے۔ خاص کر، میری قمر زمانی کی مغلانی حسینی خانم کی باتیں عجیب تھیں میں اپنی ابتدائے زندگی سے دیکھ رہی ہوں کہ اس بڑھیا کی کوشش رہتی ہی کہ یہ ظاہر کرے کہ مجھے اپنی چھوٹی بہن کی زندگی پر رشک ہی، آج سے پانچ سال پہلے، جب تم قمر سے نئے نئے بیاہے گئے تھے، اور میں تمہارے باسلیقہ و خوب صورت گھر میں اپنی بہن سے ملنے گئی تھی اس بڑھیا نے یہی خیال ظاہر کیا تھا۔ کہنے لگی:۔

"بیٹی! مفصلات میں بھلا تمہیں ایسی خوب صورت کوٹھی رہنے کو کہاں ملتی ہوگی؟"

میں نے کہا "ظاہر ہی۔"

"بیٹی، تمہاری بھی قسمت کیسی خراب نکلی۔ کیا اچھا ہوتا تمہیں رشید جیسا مشہور شاعر ملتا جو محض شاعر ہی نہیں لونڈوں کا امیر بھی ہی۔ وہ قمر کے

اضطراب اور شبہ تمہارے چہرے کو دیکھ کر جاتا رہا۔

میری پہلی آرزو یہ سُن کر یہ ہوئی کہ مجھے معلوم ہو۔ ان گمنام خطوں میں میرا نام کس کے ساتھ لیا گیا ہی۔ مگر نہ معلوم کیوں، کسی خیال نے میری زبان پکڑ لی اور میں نے کچھ نہ پوچھا۔ کیا وہ نام تمہارا تھا؟ مگر کیوں اور کس لئے؟ میں نے اپنے ضمیر کے سب سے پوشیدہ کونوں میں نظر ڈالی۔ مجھے کوئی ایسا لمحہ، یا کوئی ایسا لفظ یاد نہ آیا جو کسی مشکل پسند ضمیر کے نزدیک بھی قابلِ اتہام ہو۔ یہ بھی نہیں کہ اپنے یا اپنے شوہر کے عزیزوں میں صرف تم ہی وہ مرد ہو جس سے میری ملاقات ہو۔ میرے شوہر کے ایک چچا زاد بھائی ہیں جو خود بڑے عہدہ دار ہیں؛ اُن کا میری طرف اس قدر رجحان ہی کہ اگر میں ایک سیاست داں کی ترکیبوں کو استعمال نہ کروں تو وہ مجھ سے ہر وقت اس قدر بے تکلف ہونے پر آمادہ ہیں کہ وہ یہ بھی بھول جانا چاہتے ہیں کہ میں اُن کے بھائی کی بیوی ہوں میرا چچا کا ایک بیٹا ہی جو میرے بیاہ سے پہلے دو برس تک متواتر میرا طلب گار رہا، اور مجھے سو جان سے چاہتا تھا۔ اُسے بھی میں نے ترکیبوں سے، عاشقی کے راستہ سے ہٹا کر برادرانہ دوستی کی راہ پر ڈالا۔ اب ہم دنیا میں سب سے اچھے اور صمیمی دوست ہیں۔ مگر تم! تم سے تو کبھی پاک و صاف بھائی چارہ

کہہ رہا تھا:

"مجھے تمہاری طرف سے کچھ شبہ تھا. گو اپنے سے زیادہ مجھے تم پر اعتبار تھا لیکن میں نے ایک مہینہ اس قدر رشک کے جذبات میں گزارا کہ میں قریب قریب پاگل ہو گیا تھا۔"

میرے دل میں ایک ٹھڑ سی پیدا ہوئی؛ میں نے تجسس کے ساتھ پوچھا۔

"کس باعث اور کیوں؟"

"اگر میں کہوں تو مجھے معاف کرو گی؟"

"اس کا میں وعدہ نہیں کرتی؛ کیوں کہ میں کوئی وجہ نہیں دیکھتی کہ تم مجھ پر شبہ کرو۔"

"سچ کہتی ہو، خورشید! مگر اُن خطوں میں اس خاص نقطے پر اس قدر اصرار تھا کہ"۔

"کون خطوط، اور کیسے نقطے؟"

"چند گمنام خطوط تھے؛ مجھ جیسے سپاہی آدمی کا، ایسے کمینے اور بزدل لوگوں کی تحریروں پر اعتبار کرنا جنھیں اپنے دستخط کرنے کی بھی ہمت نہیں، بے شک قابلِ ملامت ہے۔ مگر میں نے اُن تمام خطوط کو جلا دیا۔ اور میرا سارا

وسیع و مغلق فضا میں میرے شوہر کو جو مجھ سے عمر میں صرف پانچ برس بڑا تھا، حتیٰ ایک بچہ پیچھے چھوڑ کر تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی۔ مگر یہ ماننا پڑے گا کہ یہ شخص جو اپنی بعض اوقات تحمل فرسا گرمجوشی سے مجھے اکتا دیتا تھا میری زندگی کے لطیف ترین و شیریں اوقات کا بھی باعث ہوا تھا، مگر اس دفعہ اس گرمجوشی نے (جس کی میں عادی تھی) معمول سے زیادہ طول کھینچا میں نے خیال کیا کہ اس کی تہ میں ضرور کوئی نہ کوئی بات ہے میں جانتی تھی کہ یہ آدمی جو مجھ سے کوئی بات چھپانے پر مقتدر نہیں ہے، ضرور مجھ سے سب حال کہے گا۔ میرا اندازہ غلط نہ نکلا لکھنؤ سے واپس ہوئے، مجھے تین دن ہوئے تھے۔ چاندنی رات تھی۔ ماجد کمرے میں کھڑکی کے پاس متفکر و ساکت بیٹھا ہوا تھا؛ میں سونے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ اپنی کرسی گھسیٹ کے میرے پلنگ کے قریب آیا، اور میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ کے اپنے ہونٹوں تک لے گیا اور متردد اور کچھ کچھ محجوب آواز سے کہنے لگا: "مجھے معاف کردگی ؟"

میں نے خیال کیا کہ میرے لکھنؤ کے زمانۂ قیام میں اس نے یہاں کوئی حرکت کی ہے، اُس کے لیے معافی مانگ رہا ہے۔ نوازش آمیز طریقے سے میں نے اُس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں سے دبایا۔ وہ اپنے سامنے نظر گاڑ کے

گزارے۔ کمرے پر پردے گرا دیئے گئے۔ لانگ بوٹ اور وردی اُتار کے پھینک دی گئی۔ یہاں تک کہ جب اُسے خبر دی گئی کہ اُس کی محبوب گھوڑی تھان پر بندھے بندھے شرارت کر رہی ہے، تو اُس نے اپنے چوڑے سینے کی تمام قدرتِ وسعت کو کام میں لا کر گرج کے کہا:۔

"جاؤ، ہٹو، اگر پورے ضلع کو ڈاکو لوٹ مار کر کے تباہ کر دیں، تو بھی میں فی الحال ٹس سے مس ہونے والا نہیں ہوں۔ کریچ یہاں سے اُٹھاؤ، وردی کو میرے سامنے سے ہٹاؤ، اماں جان سے جس نے تجھے بھیجا ہے میری طرف سے کہو کہ میری بیوی کو آئے ابھی تین دن ہی تو ہوئے ہیں؛ ایک ہفتہ تک سب انھیں کے سپرد ہے چلو" "کوئک مارچ" یہ کہہ کر گلشن آیا کو جو ایک مضحک خوف سے اُلٹے پاؤں جا رہی تھی، ماجد نے نکالا اور دروازہ بند کر دیا اس کی عمر ۳۸ سال کی تھی، مگر اُس کے دل اور جسم کی طراوت دس سال پہلے کے شباب کو یاد دلاتی تھی۔ آج بھی وہ ایسا ہی معلوم ہوتا تھا جیسا کالج سے تازہ تازہ نکل کے، فوراً ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس مقرر ہونے اور میرے ساتھ بیاہے جانے کے وقت تھا۔ مگر اب میں وہ لڑکی نہ تھی جو بیاہ کے بعد اُس کے گھر میں آکر اُس کی روشن آنکھوں پر عاشق ہو گئی تھی۔ میری روحِ حیات کے

سیاہ آنکھیں اندیشہ ناک تھیں۔ اپنے بازوؤں کو، جس کی گوشت کی پھڑک کو میں نے ہر وقت ایک عجیب جاذب خوف سے دیکھا تھا اُس نے کولھوں پر گرا دیا اور ایک مغموم طریقے سے وہ کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کی پہلی نظر مجھ پر پڑی میں اس وقت لکھنو کے تازہ ترین لباس میں ملبس تھی جس سے وہاں کی فسون و دلبری برس رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر ایک فوری اور لطیف تغیر پیدا ہوا۔ اُس کے بعد اپنے بھاری جسم کو ہلاتا ہوا ایک دل دوز آواز سے وہ میری طرف لپکا، اور اُس نے اپنی سیاہ، اور محترص آنکھوں سے دیوانہ وار میرے چہرے کو دیکھا۔ پھر اپنی کرخت آواز کو نرم کرنے کی کوشش کرکے مجھ سے کہنے لگا۔

"خورشید! تمہارا میرے دیکھنے کو دل چاہا تھا نہ؟ لکھنؤ سے اس قدر جلد چلی آئیں، یعنی لکھنؤ اور لکھنؤ والوں سے زیادہ ہمیں چاہتی ہو؟"

یہ باتیں بالکل قدرتی تھیں، مگر میں نے خیال کیا کہ اس میں کوئی معنی پنہاں ہیں؛ اور اس لیے مجھے ان باتوں سے خوشی ہونے کی بجائے تھوڑی سی تکلیف ہوئی۔ لیکن اس میں کیا تھا؟ میں سوچتی تھی کہ اس دماغ میں جو صرف مادّہ اور ہوس سے پر تھا کیا اور کوئی گریزاں شبہ بھی پھر رہا تھا؟

پہلے دو تین دن تو ہم نے ایک نوخیز عشق کے غشی آور جوشش

زندگی چھوڑ کر میں اس شخص کے لیے گو وہ اُس کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو، دوڑی
دوڑی آؤں گی۔ خود وہ جب کبھی لکھنؤ جاتی تو ہفتوں کی بجائے مہینوں وہاں
ٹھیرتی، اور گو اپنے بیٹے سے جدا ہو گئی تھی پھر بھی لوٹتے وقت کہتی:۔
"میرا سر پھرا تھا جو میں یہاں آ ئی"۔

روحاً و فکراً جس آدمی سے مجھے کوئی مناسبت نہ تھی، میں اُس کی
ہر زیادتی اور سختی کا سکون و بردباری سے مقابلہ کرتی تھی؛ اُس کے سبّ و شتم
کا کبھی میں نے جواب نہ دیا۔ اپنے خاندان، اور اپنے عزیزوں میں ہمیشہ بشاش
چہرہ ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ میری ساس اس کوشش پر عزت آمیز شفقت کی
نگاہ ڈالتی تھی۔ مگر اُسے یہ خبر نہ تھی کہ ایک عورت جس مرد سے اس قدر بیزار
ہو کہ اپنی موت کی دعائیں مانگا کرے، جس مرد نے تیرہ سال تک اُسے ستایا ہو
اُس کی زندگی بے مزہ و بے رنگ کر رکھی ہو، اس عورت کی زندگی میں ایسے
لمحے بھی آتے ہیں کہ وہ عورت، اُس مرد کو ناقابلِ وضاحت کشش سے چاہتی ہو
شام کا وقت تھا کہ بنگلے کی برساتی میں ایک دوڑتے ہوئے گھوڑے کی
آواز آ کر رُکی، میں اور میری بیٹی مہ لقا، دوڑ کر دروازے تک گئے ماجد نے
اپنا گھوڑا سائیس کو دیا۔ اُس کے ہاتھوں میں گہری جھرّیاں تھیں؛ اُس کی

کیا وہ اپنے کھلونے کو آسانی سے اپنے ہاتھ سے جانے دیتی؟ ہرگز نہیں غرضکہ وہ سیدھی مجھے اُس گڑھے میں لے گئی، جس کی طرف سبھے مجھے اپنی بیٹی کی سیاہ اور خوبصورت آنکھیں کھینچ رہی تھیں۔

میں گھر پہنچی، مگر ماجد کو میں نے گھر میں نہ پایا۔ وہ دورے پر باہر گیا ہوا تھا۔ میری لڑکی اپنی سیاہ چمکیلی آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھرے ہوئے مجھ سے آکر لپٹ گئی۔ میری ماں نے اپنی حلیم و شفیق نظریں اُٹھا کر مجھے دیکھا؛ مگر ان نظروں میں تجسس اور شبہ ملا ہوا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں گئی تو تھی تین مہینے کے لیے اور ڈیڑھ مہینے ہی میں واپس آگئی۔ اس کی کیا وجہ تھی؟ پھر بے خبر اچانک آنا کیا معنی رکھتا تھا۔ میرے "بچی اور ماجد کے دیکھنے کو میرا دل چاہا" کہنے پر اُس نے نیم محزوں، نیم متبسم آواز سے کہا۔

"ہاں ضرور، تمہاری اور ماجد کی ایسی ہی اچھی طرح تو گزرتی ہے کہ میں یہ سمجھوں کہ تم اُس بغیر نہیں رہ سکتیں۔"

اُسے یہ کہنے کا حق تھا۔ ہماری تیرہ برس کی زندگی ایک فاجعۂ طولانی تھی جس میں ناقابلِ بیان دردانگیز واقعات ظہور میں آئے تھے۔ اس زندگی کی یگانہ شاہد اُس کی ہمدرد و رحیم آنکھیں تھیں۔ اُسے یقین نہ آتا تھا کہ لکھنؤ کی

کی تڑپ کو اپنے ہی ساتھ خاموشی سے لے جاؤں، تو کسی کو یہ بھی معلوم نہ ہوتا کہ میں کہاں غائب ہوگئی اور کیونکر غائب ہوگئی۔ میں ایک عورت ہوتی جو ایک راز، ایک معما کی طرح بغیر حل ہوئے رہ جاتی، یہ ایک ایسا محبوب خیال تھا کہ اگر میری لڑکی کی سیاہ آتشیں آنکھیں ابدیاً میرے لئے روتی ہوئی، انتظار کرتی ہوئی، میرے تخیل کے سامنے نہ آجاتیں تو میں اس ارادہ کو پورا کر گزرتی مجھے کیا خبر تھی کہ کچھ دنوں کے بعد مجھے اپنے وطن سے، ایک راز، ایک معما کی طرح غائب ہونا ہی پڑے گا۔

انسان، اپنے مستقبل کے مقابلہ میں کس قدر عاجز و ناتوان ہے۔ اُسے نہیں معلوم ہوتا کہ اگلے چند دن، یا چند گھنٹے زندگی کی کیسی مصیبتیں، کیسی فلاکتیں یا کیسی خوشیاں، کیسی مسرتیں اپنے میں چھپائے ہوئے ہیں۔ اگر آئندہ کے پنہاں صدمات یا متبسم تجلیات کی ہمیں خبر ہو جائے، تو ہم شاہراہ حیات پر اس طرح اپنے کو رانہ چلے جلنے پر کیسے ہنسیں۔ اگر اس وقت اپنی خواہش کے مطابق میں اپنے تئیں ٹرین کی کھڑکی سے نکال کے اُس فضائے تاریک میں پھینک دیتی، تو آج کے دن اس تلخکامی کے احساس سے بچ جاتی۔ مگر جس قسمت نے، اس اعتنا کے ساتھ مجھے اس جال میں پھنسایا تھا،

گمنام خطوط

(خورشید لقا بیگم کا خط اپنے بہنوئی کے نام)

میں للت پور جا رہی تھی۔ رات تاریک تھی؛ اور ٹرین کے انجن کا کثیف دھواں اس تاریکی کو کچھ کم نہیں کر رہا تھا، بڑھا ہی رہا تھا۔ اس عظیم الشان اور وسیع تاریکی میں، گاڑی کی کھڑکیوں میں سے نکلنے والی روشنی نے، ٹرین کو ایک چمک دار اور تیز رو، ہزار پا کیڑا بنا رکھا تھا جو بل کھاتا ہوا جا رہا ہو۔ اس محیطِ حزن و خوف میں میرے لیے ایک عجیب کشش تھی، میں بار بار سر نکال کے اس تاریکی پر نظر ڈالتی تھی اور میرا دل چاہتا تھا کہ اس میں غائب ہو جاؤں۔ میں اسٹیشن پر پہنچی؛ مگر وہاں میرے لینے کے لیے کوئی نہ تھا۔ میں جس طرح تمہیں اطلاع دیئے بغیر لکھنؤ سے روانہ ہو گئی تھی، اسی طرح بغیر کسی اطلاع کے یہاں پہنچی تھی۔ میں نے چاہا کہ اپنے شوہر سے اچانک جا ملوں بالفرض اگر میں اس تاریکی میں غائب ہو جاتی، تاکہ اُس مجموعۂ حیات کو جسے تنہا میں ہی محسوس کرتی ہوں ختم کروں، اور اپنے دل کی حسرتوں، اپنی روح

"اے عورت!" "یا حووا" نے تیری روح کی طرف التفات کیا، جو تو چاہتی تھی وہ تجھے دیا تو بھی اس کرمِ خاص کے عوض میں بنی اسرائیل کی جانوں کو بچا" میں نے اپنا سر اُٹھایا، اور اُس انقیادِ مطلق سے جو میری طبیعت میں ابھی پیدا ہوا تھا میں نے کہا :-

"بہت اچھا، مگر مجھ پر اک نظر تو ڈال، مجھے اک چھوٹی سی نوازش سے محروم نہ رکھ آہ! میں کتنے برسوں سے تیرا انتظار کر رہی تھی" اُس نے اپنے لمبے اور نرم ہاتھ میرے سر کی طرف بڑھائے مگر عین اس وقت بخت نصر آنکھوں سے شعلے برساتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور پرغضب آواز سے کہنے لگا :-

"اس خانہ بدوش کو اپنا عاشق کرنے کے لیے تو نے یہاں بُلایا تھا، لے جاؤ اِسے" اس وقت میں نے معلوم کیا کہ میرا تمام افسون، میرا تمام طلسم جو انسانوں پر تھا ختم ہو گیا، اور اُس جانور کے سامنے جسے میں نے اپنا مطیع و منقاد کر رکھا تھا میں عاجز کھڑی تھی، بخت نصر کا آخری حکم اس وقت تک میرے کانوں میں گونج رہا ہے :-

"استارت کو باغِ آویزاں میں اس کے بالوں سے لٹکا دو۔ اور بنی اسرائیل کو ایک ایک کر کے اُس کی آنکھوں کے سامنے ذبح کرو۔"

دولت کی شان، انسانوں کی عبودیت، انسانوں کے خون، اور اجرامِ فلکی جس روح کی تاریکی دُور نہ کر سکے تھے، اس وقت اُس کے آنکھوں کی روشنی اُس روح کو منور کر رہی تھی۔ اب میرے لیے، نہ دولت کی شان، نہ انسانوں کے خون، نہ اُن کی بندگی، نہ زمین نہ آسمان، نہ اجرامِ فلکی، کچھ نہ تھے، میری روح، میری حسیات میں سے کائنات محو ہو چکی تھی۔ میرے لیے صرف وہ سیلِ نور تھا جو اُس کی آنکھوں سے نکل رہا تھا، یہ نور تھا اور میری روح کی وہ مسرت تھی جو چشمے کی طرح اُبل رہی تھی۔

میں اپنے تخت سے اُتری، اُس کی ثابت اور ضیا بار آنکھوں کی طرف سیدھی کھنچی چلی گئی۔ میں نے اپنے بالوں میں سے طلائی موباف نکال پھینکا اور اُن قدموں کو جو فلسطین سے یہاں تک آنے میں پتھروں پر چلنے سے چھل گئے تھے، اپنے لمبے کھلے ہوئے پریشان بالوں سے ڈھک لیا، اور کہا:۔

"تو بھی اسی طرح عشق کے سنہری تاروں سے میری تشنہ روح کو جو سالہا سال سے تیرا ہی انتظار کر رہی تھی ڈھک دے"۔

اُس نے چند لمحے جواب نہ دیا۔ جب اُس نے بات کرنی شروع کی تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ایک معبود اپنی معظم و نجات بخش رحمت تقسیم کر رہا ہے۔ اُس نے کہا۔

سامنے بے خوف رہتا تھا داخل ہوا۔

مجھے اپنی طاقتِ حسن پر اتنا بھروسا تھا کہ میں جانتی تھی کہ وہ سرکش طبیعتیں جو آفتابوں، معبدوں، معبودوں کے سامنے سجدہ نہ کرتی تھیں، میرے حسن کے سامنے سے سر بسجود ہو کر میری پرستش کرتی تھیں۔

یہ نوجوان کمرے میں داخل ہوا، ایک کھال اوڑھے ہوئے، بازو اور کندھے کھلے ہوئے۔

بابل کے سورماؤں کے سانولے ہاتھوں پر، اور بازوؤں اور چہروں پر رگیں اس طرح اُبھری ہوئی ہوتی ہیں جیسے بٹی ہوئی رسّی، مگر اس نوجوان کی گوری اور ہموار جلد پر ایک ساکت اور مطمئن قوت کا احساس ہوتا تھا۔ اس کا اصلاً صبیح مگر تمازتِ آفتاب سے سرخ چہرہ کتابی تھا جس میں ایک ایسی روحانیت جھلکتی تھی جس کا میں اب تک تصور بھی نہ کر سکی تھی۔ اس کے شانوں پر گھنے سنہرے بال لہرا رہے تھے۔ اُس کی آنکھوں میں۔ سمندر کی اور آسمان کی نیلاہٹ اُس کی روح سے مل کر ایک ضیائے رنگین پیدا کر رہی تھی اور یہ ضیائے رنگین میری روح کے خالی نقطے میں، جسے اس قدر برسوں سے، اس قدر طویل مدت میں کسی چیز نے نہ بھرا تھا، نفوذ کر رہی تھی، میری روح اب تک تشنہ تھی،

اک شخص ہی جس کی روح پر میں تسلط حاصل نہیں کر سکا، وہ اک سپاہی منش آدمی ہی موت کی ہر شکل پر اُس کی آنکھیں ہنستی ہیں، وہ ایک بہادر روح رکھتا ہی میں اسے برداشت نہیں کر سکتا کہ میں اُسے مرعوب نہ کر سکوں۔ یہ شخص جو میرے سامنے بالکل بے ہراس رہتا ہی، میں چاہتا ہوں کہ اُس کی آنکھوں میں خوف دیکھوں، بتا کہ میں اُسے کس اذیت میں مبتلا کروں کہ وہ میرے سامنے کانپے"

میں نے کہا:۔ "کل اُسے میرے سامنے لایا جائے۔ میں جانتی ہوں کہ اُس کے ساتھ کیا کرنا چاہیئے"۔ دوسرے دن، میں محل "طلائی آفتاب"، میں گئی اس کی چھت میں اک مرصّع طلائی آفتاب بنایا گیا تھا، کمرے کا فرش اور دیوار و در اُس کے طلائی نور سے دمک رہے تھے، میں اپنے زرتار بالوں میں اک طلائی موباف لگائے ہوئے تھی، میرے حسین جسم پر اک طلائی ملبوس تھا، میں اس طلائی کمرے میں اس دبدبہ و احتشام کے ساتھ داخل ہوئی کہ دنیا پھر اُس کی مثال نہ دیکھے گی۔ اک طلائی تخت پر جو نہایت سبک دست، نہایت ماہر صنّاعوں کی صنعت گری کا نمونہ تھا، میں متمکن ہوئی اور وہاں میں نے اُس کا انتظار کیا۔ تھوڑی دیر میں میں نے دیکھا کہ دروازہ کے مرصع طلائی پردوں کو اک غلام کے سیاہ ہاتھ نے ہٹایا، اور بنی اسرائیل کا وہ نوجوان جو بخت نصر کے

دیوتاؤں اور اپنی زندگی میں ظلم و اذیت اور اُس کے مظاہر کی پرستش کرتی ہے، شاید اسی وجہ سے مجھے پیار کرتی ہے کہ میں نے ظلم اور اذیتوں کے نئے نئے طریقے انھیں سکھائے ہیں۔

بخت نصر، وہ الہٰ ظلم جو دنیا میں موت اور خون تقسیم کیا کرتا تھا، مجھ سے آکر رائے لیا کرتا تھا۔ یہ حاکمِ قہار جو دنیا کے اوپر، انسانوں کے اوپر، ایک حکمرانِ مطلق کی حیثیت سے، اپنی رعایا کا گلا گھونٹتا تھا، ایسے لمحے بھی ہوتے تھے کہ میں، اس کی رعایا کی طرح اُس کا گلا گھونٹتی تھی۔ میں نے گھنٹوں اس منظر سے لطف اُٹھایا ہے کہ اپنے مرمر کے دروازے کی چوکھٹ پر اُس کے تاجدار سر کو میں نے ٹھکرایا ہے، اور وہ اک زخمی شیر کی طرح غرایا ہے اور پھر خاموش ہو کر رہ گیا ہے۔ اس رات میں اپنے محل کی سیاہ چھت کو دیکھ رہی تھی، جس میں آسمان کی تقلید میں چاندی کے چمکدار ستارے جڑے گئے تھے کہ مجھے معلوم ہوا کہ بخت نصر آ رہا ہے۔ اُس نے سب ہتیار میرے کمرے کے دروازے پر اُتار کر رکھ دیئے اور ایک سانپ کی طرح سرکتا ہوا میرے حضور میں آیا اور کہنے لگا:۔

"اشتارت! میں نے فلسطین میں ہر چیز پر قبضہ کر لیا، اور اک سرے سے دوسرے سرے تک اُسے ویران کر دیا اور جلا کر خاک کر ڈالا، مگر وہاں

بن جاتی، تو بھی میرے لیے یہ سب کچھ ہیچ تھا۔

اس لئے کہ میری روح میں ایک نقطہ، ایک عمیق و حاکم نقطہ خالی تھا، اس نقطہ کو نہ دولت کی شان، نہ انسانوں کی بندگی، نہ اُن کے خون، اور نہ اجرامِ فلکی بھر سکتے تھے، وہ نقطہ ایک ایسے وجود، ایک ایسے رفیق کو ڈھونڈھتا تھا جو میری زندگی کے باریک ترین عنصر میں سکون و حظ پیدا کرے۔ اک دن میں اپنے باغیچہ کے سب سے زیادہ رنگین سب سے زیادہ چمکیلے پھولوں کے دستے میں لیٹی ہوئی تھی۔ کہ میرے کانوں کو سپاہیوں کی ہائے ہو، اور ہتھیاروں کی جھنکار سنائی دی، یہ سپاہی ارضِ فلسطین سے فاتحانہ واپس ہو رہے تھے اور اُن کے نعرے بابل میں گونج رہے تھے۔

اب میرے حضور میں کتنے قیدی آگ میں جلائے جائیں گے، کتنوں کی آنکھیں نکالی جائیں گی، کتنوں کی کھال کھینچی جائے گی، کیا کیا شکنجے، کیا کیا تکلفیں کیا کیا اذیتیں دی جائیں گی، اور فریادوں کے ساتھ خون کی نہریں ہم آہنگ ہو کر بہینگی۔ زمین میرے باغ کے محبوب ترین لالہ زار سے زیادہ سرخ، زیادہ آتشیں رنگ میں رنگی جائے گی۔ خود بخت نصر، آ کر مجھ سے نئی اذیتوں، نئے شکنجوں کی ترکیبیں پوچھے گا۔ یہ ظالم و خونخوار قوم، جو اپنے معبدوں، اپنے

(ج)

بخت نصر کا قیدی

بابل کے باغیچہ ہائے آویزاں میرے ہی لیے بنائے گئے تھے۔ میں بخت نصر
کی محبوبہ اشتارت تھی۔ جس دیوی کے نام پر میرا نام تھا، میں اُسی کی طرح حسین تھی
اُسی کی طرح میں ایک ریشمی لباس پہنے رہتی تھی جو مردوں کی روحوں کو قید
کرنے کے لیے اک جال تھا۔ میرے دامن سے کسی کا سر چھو جائے، وہ بے چارہ
اُس دامن کے نرم تاروں میں پھنس کے رہ جاتا تھا۔ جتنا اُس سے نکلنے کی
کوشش کرتا تھا اُتنا ہی اور پھنستا تھا، اتنا ہی اور اُس کے گلے میں پھندا پڑتا،
میرے ذرا سے حکم، میرے خفیف سے اشارے پر خون کے آبشار گرتے تھے، دریا
بہتے تھے، انسان بھیڑوں کی طرح ذبح کئے جاتے تھے، دنیا کی بڑی سے بڑی
سلطنت وہ شکل، وہ رنگ اختیار کرتی تھی جو میں اُسے دینا چاہتی تھی، اور
وہ تاجدارِ معظم جو تمام دنیا پر حکمرانی کر رہا تھا، میرے گورے پاؤں کے نیچے، اک
زبوں و عاجز قیدی کی طرح پڑا رہتا تھا، مگر میں خوش نہ تھی۔ ہاں، اگر ستارے
میرے کمرے میں جمع ہو کر، چراغ کا کام دیتے اور آفتاب میرے محل کو گرم کرنے
کے لئے انگیٹھی بنتا، اور دنیا میرے پسندیدہ پھولوں سے لد کر میرا پائیں باغ

اُس سے پوچھا:۔

"پیاری لڑکی؟ یہ تو بتا کہ تیرے روحانی اور بے داغ جسم کو کبھی بشری خطاؤں کا دھبّہ تو نہیں لگا؟"

اُس نے اپنی نور فشاں مگر خیال پرست نظروں سے میرے دل کی گہرائیوں تک کو چھید ڈالا، جس نے مجھے بتایا کہ جس طرح اُس کی روح، فضائے لاہوتی میں اپنے سفید پروں سے پرّاں ہے، اسی طرح بشری کمزوریوں کے بھنور، اور خطاؤں کی گہرائیوں میں بھی پھڑپھڑا چکی ہے۔ مگر میں ان رازوں کو جن سے دُنیا بے خبر رہی ہے کبھی زبان پر نہیں لاسکتا۔ کیا اُس نے بھی، ہر انسان کی طرح محبت کے عذاب جھیلے، تاریکیوں میں ٹھوکر کھائی، شعلوں میں گری یا نہیں گری؟ اسے صرف ہیپاشیا کی روح جانتی ہے یا میں۔

وہ جب ہر سال اپنا فسانہ اپنی آنکھوں سے مجھے سُناتی ہے، میں سفید اور سنہرے بادلوں میں سے نکل کر، اور اپنی زرد اور ٹھنڈی شعاعیں اُس کے محبوب چہرے، اور اُس کے باکرہ جسم پر ڈال کر، شفقت و نوازش سے اُس کے بوسے لیتا ہوں، اُس کی تقدیس کرتا ہوں، آخر کار وہ بھی، اُن دونوں کی طرح سبز پانی کی شیریں اور منتظر آغوش میں اپنے تئیں ڈال دیتی ہے اور غائب ہو جاتی ہے۔

انسانوں کے انبوہ میں پیروانِ عیسیٰ بھی ظاہر ہوئے ؟ ان حضرات کے تشریف لانے کے نتیجے سے، پیارے چاند! تم بے خبر نہیں ہو؟"

یہ کہتے وقت اپنے حسین جسم کی پوری قابلیتِ عظمت کے ساتھ کھڑی ہوتی ہے، اور اپنے کندھوں کو اونچا کرتی ہے اور ایک لطیف وقار کے ساتھ جو اولمپا کے حسین اور بلند مرتبہ دیوتاؤں سے حاصل کیا گیا معلوم ہوتا تھا اپنے سر کو آسمان کی طرف متوجہ کرتی ہے۔

"یہ پیروانِ عیسیٰ آئے اور اُس خونخوار درندوں کے غول کی طرح جو خون پینے کے لیے کسی کے پیچھے جھپٹ رہا ہو، مجھے اپنے کلیسا تک گھسیٹ لے گئے اور اپنے بے گناہ عیسیٰ کی تصویر کے نیچے جو مغموم مگر روحانی نظروں سے انھیں دیکھ رہی تھی، مجھے ذبح کیا اور میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ مجھے تو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا، مگر میرے دماغ کے تخیلات کے ستارے، اب بھی مرتفع، اب بھی ضیا بار، اب بھی آسمانِ ابدیت میں درخشندہ ہیں اور رہیں گے۔"

اُس نے جب یہ دل دوز تقریر ختم کی، تو اُس سوز و گداز کے ساتھ جو زلیخا اور کلیوپیٹرا کے ماجرائے عشق نے مجھ میں پیدا کر دیا تھا، میں نے

دیکھ رہی تھی جو افلاطون کی بزرگ روح نے انسانوں کے لیئے دیکھا تھا، میں چاہتی تھی کہ سب انسان، آنکھ، روح اور فکر کے ذریعے، پروردۂ حسن و خوبی ہوں، نیچر کی خوبصورتی، صنعت کی خوبصورتی، اُن کے چاروں طرف تبسم ریز ہو، اور اُن کے دماغ حسنِ سماوی کی طرف بالا پرداز ہوں، میں چاہتی تھی، کہ انسان کے قوائے ذہنیہ علم کے زیور سے آراستہ ہوکر (کہ قوائے ذہنیہ ہی انسان کی بلند ترین تجلّی ہیں) مادہ اور جسم کی سفلیت و تاریکی پر غالب ہوں۔ آہ! اس کے لیے میں نے کیسی کیسی کوششیں کیں، مگر ہوا کیا؟ ادہر اُس مونس و روحانی مسیحا کی اُمت جو انسان کو بچانے کے لیے آیا تھا، انسانوں کو عذاب و شکنجہ میں کھینچ کھینچ کر، فکر اور دماغ کو تعصب و جہالت سے بھر بھر کے تاریک کر رہی تھی، اور ظالم و خونخوار بن کر میرے پاک خواب کو برباد، اور میرے تمام مجاہدے کے مقابل میں دیوارِ آہن استادہ کر رہی تھی ادُھر روما کے بیمار و کثیف بیچے، اور پھر گال کے وحشی میرے رویائے علمی میرے خواب ارتقاد نجات انسان کو، اپنے دنی اور ذلیل حرکات سے پراگندہ و پریشان کر رہے تھے۔ آخر ایک دن آیا کہ ان ہزاروں جنس والے، ہزاروں مذہب والے

نظریں اس قدر زمین سے علیحدہ، اس قدر گردوں پیما تھیں، کہ میں اکثر یہ سوچا کرتا تھا کہ وہ کوئی سرابِ فلکی ہی۔ میری اور اُس کی شناسائی اسی زمانے سے ہی۔ میں جس وقت اسکندریہ کے اوپر سے گزرتا تھا، وہ اپنی پاک اور خوب صورت آنکھوں پر دُوربین لگا کر مجھے گھنٹوں دیکھا کرتی تھی اور پھر پاپیرس کاغذ پر عجیب خطوں سے کچھ لکھا کرتی تھی۔ حسبِ معمول میں ایک رات، اسکندریہ سے گزر رہا تھا، اور حسبِ معمول میں نے اُس کی کھڑکی میں سے جھانکا۔ میں نے اُس کا گھر خالی پایا۔ آج زلیخا و کلیوپیٹرا کے بعد جو وہ نکلی تو میں نے اُس سے پوچھا کہ کرۂ خاک سے وہ کیوں روپوش ہوگئی؟ اس نے اپنے پیارے سر کو جو یونان کی عقل وحکمت کی دیوی ایتنا کا تجلی گاہ بنا ہوا تھا میری طرف اُٹھایا اور اُس یاس سے جو تمام علما و کملائے دہر کو دنیا سے رہی ہی، اُس نے مجھ سے کہا:۔

"میں نے انسانوں کو قعرِ مذلت میں سے نکالنے اور اُبھارنے کی کیا کیا جدوجہد نہ کی۔ اے پیارے چاند! تو اس کا شاہد ہی۔ انسان، جس وحشت و بہیمیت میں مبتلا ہی، وہ نظارہ اپنی دل خوں کن تجلیوں میں میری آنکھوں کے سامنے تھا، مگر میں اُس وقت اُس پاک و علوی خواب کو دوبارہ

غائب ہو جاتی ہے۔

---

(۳)

سب سے آخر میں، ہیپاشیا سبز موجوں کے پردے کو ہٹا کر یکایک نیل کے کنارے نکلتی ہے۔ کہنیاں گھٹنوں پر رکھے، سر ہاتھوں میں لیے ستارے کی طرح روشن آنکھوں کی نمدار نظریں نیل کی طرف کئے ہوئے وہ بڑی دیر تک، نیل سے رازِ دل کہتی ہے۔ میں اس حسین و متفکر چہرے کو بہت پیار کرتا ہوں۔ ایک زمانہ تھا کہ اسکندریہ، مرمر کی سفید عمارتوں، کتب خانوں، عجائب خانوں اور باغوں سے اک شہرِ مخیل جیسا دل ربا شہر بنا ہوا تھا اور وہ کاندھوں پر نرم ریشمی عبا ڈالے، پاؤں میں خوبصورت چپلیاں پہنے اس شہر میں مصروفِ خرام تھی، دماغ میں نفیس افکار، عالی فلسفے بھرے ہوتے تھے۔ اس کی روح کی طرح اس کا جسم بھی باکرہ عصمت مآب تھا، اور اس عصمت کے حظِ تکبر سے متکبر رہتا تھا۔ اس ملک میں جس نے اپنے سنگِ مرمر کے سوا، ہر چیز کو میلا اور لکّہ دار کر دیا تھا، صرف ہیپاشیا کی روح پاک و صاف تھی، اُس کے افکار، اُس کے خیالات، اس کی

مگر آج کی رات، جب کہ جون کی گرمی میں ریگستان آتشِ حیات سے متحرک ہی، اور وہ زمین پر اپنا پرانا فسانۂ عشق بیان کرنے آئی ہی، اُس کا ایک بھید ہی جسے میں ہی سمجھتا ہوں اور دنیا میں کوئی نہیں سمجھتا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ بظاہر ظالم عورت، ایک کمزور عورت ہی جو تمام عمر عشق کے ہاتھوں ستائی گئی، وہ ایک ملکہ ہی جس کی تمناؤں کا اتنا خون ہوا، کہ وہ ایک سانپ سے موت کی بھکاری ہوئی۔

وہ بہت کم باتیں کرتی ہی، مگر اس کے اوضاع، اس کی حرکات سے کیا کیا نہیں ٹپکتا۔ مثلاً جس وقت وہ اپنے آخری عذابِ الیم کو دوبارہ اس زمین پر بیان کرنا چاہتی ہی تو وہ صرف اپنے ہاتھ کو نیل کی کیچڑ میں ڈالتی ہی، وہاں اُسے ایک چھوٹا سا سانپ ملتا ہی جسے وہ باہر نکال لاتی ہی اور اُسے اپنے سینے پر رکھتی ہی۔ پھر اپنے عبا کو اپنے اوپر ڈال لیتی ہی اور اُس جسم کو جو موت میں بھی ایک طرف قیصر و کسریٰ کی شان یاد دلاتا تھا، اور ایک طرف ایک پھول ایک ستارہ، یعنی ایک عورت کا جسم تھا اُس شاہانہ لباس سے ڈھک لیتی ہی اور نیل کے سبزی مائل پانی میں جو اپنے شیریں آغوش میں اُسے لینے کے لیئے منتظر ہی، اپنے تئیں ڈال کے

اُس کے حسین جسم کے ہر عضو میں، غمِ الفت، دیوانگیٔ محبت، ابتلا و مظفریت، جلوے دکھاتی ہیں اس عورت کا سیما، اس عورت کی روح نامتناہی ہی۔ اس کی زندگی ایک مدید لمحۂ حرص رہی ہی جس میں وہ ہر آن ایک نئے جلوے، اک نئی روح سے ظاہر ہوتی ہی، اس وقت کہ اس کا بجرہ نیل پر تیرتا ہوا جا رہا ہی، اُس کے چہرے کے گرد ہزارہا روحیں جنھوں نے اس کے عشق کے عذاب اُٹھائے ہیں، اب بھی اُن عذابوں سے آتش زیر پا، مگر پروانہ وار چکر لگا رہی ہیں۔ ان پروانوں میں کون کون ہی؟ بڑے سنجیدہ دماغ والے، عقل مند لوگ ہیں جو اُس کی متلون مزاجی، کبھی متواضع، کبھی مغرور اداؤں کے شکار ہو چکے ہیں، بڑے بڑے با اقتدار محتشم شاہنشاہ ہیں، یہ اُس حسن کی کشش میں کھنچے چلے آئے ہیں جیسے وہ زہرہ سے مانگ کر لائی ہی۔ یہ بچارے سب کے سب وہ اسیر ہیں جنھوں نے تھوڑی دیر کے لطف اور وجد کے بدلے میں اُس کے بیدرد ہاتھوں سے زہر کے پیالے پیے اور نیل میں ڈبوئے گئے۔ یہ کہنا چاہیے کہ اس تماشاگاہِ عالم میں وہ ایک بڑی ایکٹرس تھی، جو عشق کا کھیل کھیلنے، نہیں نہیں، بلکہ عشق کی زندگی بسر کرنے ہی کو آئی تھی۔

(۲)

اس کے بعد، کلیوپیٹرا اپنے تمام طنطنہ، احتشام، اپنی تمام شان و شوکت کے ساتھ نکلتی ہے۔ وہ اُس سج دھج سے آتی ہے جو اُس نے اپنے آخری سپاہی عاشق کو دکھائی تھی، اُس عاشق کو جس نے اُس کے متلوّن اور ہرجائی دل کو موہ لیا تھا۔

سواری کا بجرہ سونے کا ہے، چپو چاندی کے ہیں، بادبان ریشم کے، جن میں سے وہ معطر خوشبوئیں نکل رہی ہیں جو لذیذ آرزوؤں سے ہوا کو بھی مست کر رہی ہیں۔ خود زرتار ریکیوں سے کمر لگائے اپنی حسرت اور ارمانوں کو لیئے دعوت کار، طلب، گار لیٹی ہے۔ اُس کے نازک نرم جسم کی ادنیٰ حرکت میں لطیف اشاراتِ احتراص پیدا ہوتے جنھیں بلیغ موسیقی سمجھانے کی کوشش کر رہی ہے اور نہیں سمجھا سکتی۔ اُس کے سادہ نیلے نازک چہرے کے گرد، اُس کے چمکیلے اور نرم بال، اک ادائے تسلیمیت سے اپنی پوری رونق کے ساتھ پڑے ہوئے، ایک دل آویز تصویر کا چوکھٹا بنے ہوئے ہیں۔ اس کی دل کش پیشانی میں، اس کی مخمور آنکھوں میں، اُن ہونٹوں میں جس کی ہر جنبش میں اک داستانِ عشق نہاں ہے،

آخری قطرۂ محبت وفیض کسی کو دینے سے دریغ نہیں کرتی، لیکن خاموش رہتی ہے، میں بھی اپنے عشق کے درد وسوز کے بیان کرنے اور اس تصویر میں رنگ بھرنے سے احتراز کروں گی، مگر کیا یہ بھی نہ کہوں کہ تیری حقیقی اولاد یوسف نے ہی، میری اس عصمت و وقار کے باوجود، میری روح میں یہ آگ بھڑکائی تھی۔ وہ جب اس دنیا میں تھا، اس وقت جس طرح میرا دل اپنی منفرد اور پوری قابلیتِ جوشش کے ساتھ، اُس پیارے چہرے کے لئے تڑپتا تھا، اب بھی اسی طرح تڑپتا ہے۔

تو اپنے فیض کو، اپنی ٹھنڈی اور بے جان برکت کو آخری دم تک اپنی اولاد کو بخشے گی، میں، تیری سچی بیٹی زلیخا بھی ابد تک اپنی روح کے آخری شعلے، آخری حرارت کو اُسی کے لیے محفوظ رکھوں گی۔"

اپنے ایمانِ عشق کی اس طرح صمیمیتِ روح سے تکرار کرکے وہ اپنے لمبے اور شاندار بازوؤں کو اس نم ناک و پُر فیض زمین کی طرف اس طرح بڑھاتی ہے گویا اُس سے لپٹنا چاہتی ہے، اس کی تقدیس کرتی ہے اور آخر کار اُن سبز، ہلکی موجوں میں جو اُسے اپنی شیریں آغوش میں لینا چاہتی ہیں ڈوب کر چلی جاتی ہے۔

اُس کی تمام حرکات ایک عمیق اور معنی دار مقدس بھجن کی طرح پُر آہنگ متوازی اور سنجیدہ ہیں۔ وہ مصر کی سب سے پُرانی عاشقہ اور تمام عالمِ ماضی کی سب سے زیادہ حسین عورت ہے۔ اُس میں ایک ایسی پُر عظمت ادا ہے جو صرف اُن عورتوں میں پائی جاتی ہے جن کا قلب سوائے ایک منتخب آتش کے شعلہ کے، ہر چیز کے لئے بند ہو چکا ہے، جو ایک یگانہ اور برگزیدہ عشق کی محشر زائیوں میں اپنی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ وہ سال میں ایک مرتبہ اس برکت دار اور حاصل خیز زمین پر جو اُس کی صحنۂ عشق و حیات رہ چکی ہے آتی ہے۔ اُس کے بازو، اور شانے سادہ مگر پُر ارمان حرکتِ حیات سے متحرک معلوم ہوتے ہیں، بولتے وقت، خُرمے کے درختوں کی شاخوں کے نیچے، ہوا میں اوپر تلے آتی جاتی ہے اور اُس کی عظمتِ رفتار سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمین سے کسی زیادہ بڑے سیّارہ کی ملکہ ہے اُس کی آوازیں گہرے، صمیمی اور درد انگیز نغمے بھرے ہوتے ہیں، وہ کہتی ہے:-

"اے ارضِ مقدس! جس نے میری روح کو آتش و حرارت میں مبتلا کیا ہے۔ اے تیرے پُر فیض، حیات و فراوانی بخش سینہ پر تیری حقیقی بیٹی پھر آئی جس طرح تو اپنے سینے، اور اپنے دل کی گہرائیوں میں سے

سست خرام پانی کی سطح متورپر، میرا چہرہ کنارے کی بمدار شادابیوں میں سے چھن چھن کر پھسلتا ہوا نظر آتا ہے اور میں خود اُس کی سیر کرتا ہوں۔

ہر سال، مقررہ رات کو تینوں اسی جگہ سے نکلتی ہیں جو خرما کے درختوں کی شاخوں سے ڈھکی اور چھپی ہوئی نیل کی ایک محرمیت ہے اور جہاں وہ ہر سال غوطہ کھا کے غائب ہو جاتی ہیں۔ ہر سال اُسی رات کو اُسی مقام سے نکل کر، تینوں اپنے افسانہائے عشق بیان کرتی ہیں۔ اس کے بعد، تینوں میری آخری شعاع کے ساتھ، سبزی مائل نیل میں ڈوب جاتی ہیں، اور اپنے مستثنیٰ جسموں کو دریا کے نیم گرم پانی کی آغوش میں ڈال کر، اپنے متفکر چہروں کو، اور اپنی مغموم اور مکدّر آنکھوں کو جو اُن کے اضطراب آمیز عشق و جنوں کا آئینہ ہوتی ہیں۔ آسمان کی طرف متوجہ کئے ہوئے ماضی کی طرف جہاں سے آتی ہیں لوٹ جاتی ہیں۔

---

(۱)

سب سے اوّل زلیخا نکلتی ہے اس کے سیاہ بال نہایت شاندار طریقہ سے گندھے ہوتے ہیں، جن پر ایک سفید سادہ اوڑھنی پڑی ہوتی ہے۔ آنکھیں بڑی اور سیاہ ہیں جو اس طرح چمک رہی ہیں جیسے دو سیّال آفتاب

لیکن عین اس وقت ڈراؤنی آوازیں مجھے سنائی دیں میں نے سر پھرا کر دیکھا۔
میں نے دیکھا کہ ایک غول ایک خوف ناک مخلوق کا جن کے چہرے سیاہ
جن کی آنکھیں شعلہ بار تھیں۔ ننگے پاؤں، ننگے سر میری طرف بڑھا چلا آرہا ہے
ان کی نظروں میں قہر و غضب۔ ان کی آوازوں میں تہدید اور ڈپٹ ہر لمحہ اور
بڑھتی جاتی تھی۔ وہ میری طرف اور بڑھے۔ چاندنی کی سکوت میں اس میں سے
ایک سوکھی ہوئی ڈراؤنی آواز نے کہا:

"ایک پاک باز آدمی کو اس نے بہکایا ہے۔ اس کی منحوس روحِ شیطانی ہے
اس کو اس کے جسم سے نکالو اور آگ میں ڈالو"۔

(ب)

مصرِ قدیم کی محبوبہائے عاشق نواز

چاند نے کہا کہ:

جون کے مہینے میں جب کہ ریگستان آتشِ حیات سے متحرک ہوتا ہے،
میں ایک رات اُس سنہرے ریت کے سمندر پر جس میں اہرام خوابیدہ ہیں،
اُن ہلکے بادلوں میں جو نیل گوں آسمان پر چھائے ہوئے ہوتے ہیں مصرِ علیا
سے مصرِ سفلیٰ کی طرف پیرتا ہوا جاتا ہوں۔ دریائے نیل کے سنہری مائل

کی لپٹ میری روح کی گہرائیوں کی طرف آ رہی ہے اور میرے شباب کی بشری آرزوؤں کو جنھیں میں نے اب تک روکا تھا بھڑکا رہی ہے۔ تو مجھ سے کیا چاہتی ہے؟"

چاند اس وقت سیاہ جنگل کے عین اوپر آ چکا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دیوتاؤں نے ہمارے عشق کو روشن کرنے کے لئے ایک سنہری مشعل بھیج دی ہے۔ میں نے اس کا جواب نہ دیا۔ صرف زرد باریک ریشم کے دوپٹے کو اوڑھے ہوئے جس کی کامدانی پر چاند کی شعاعِ پُرفسوں پڑ رہی تھی۔ میں نے اس کے سامنے اپنا بہترین، اپنا استادانہ ناچ ناچا۔ اور زبانِ رقص سے اپنی حکایتِ عشق کہی۔ اس وقت چمک دار لباس میں میرا جسم، میرے بازو اور جسم ہی نہیں میری روح بھی بلیغ و آہنگ دار تجلیات کے ساتھ اس کے حضور میں رقص کر رہی تھی۔ میں اس وسیع میدان میں چاند کی زرد اور تنہا روشنی میں ایک چاند کا ٹکڑا معلوم ہو رہی تھی یا ایک بسنتی پری بنی ہوئی تھی اور میں اپنی روح کے تمام درد و آلام کو تمام حسرت و اضطراب کو، اپنی اوضاع کی اشارے سے زبان سے نہیں، اس سے کہہ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس کی سیاہ آنکھوں کی تابش سے اس کی روح اس کا دل میری طرف آ رہا ہے اور آ رہا ہے اور قریب آ رہا ہے۔

کھلنی، چمکنی شروع ہوئیں۔ دُور سے جنگل کی ہیبت ناک درندوں کی آوازیں
دھاڑیں سنائی دیتی تھیں۔ مندر سے اک کالا ناگ بل کھاتا ہوا نکلا اور
چلا گیا۔ چاند ایک سنہری تھال کی طرح، درختوں کی سیاہ شاخوں پر سے
نکل رہا تھا۔ میں نے اُس کے پاؤں کی آہٹ سُنی۔ جون ہی وہ مندر کے
دروازے کے قریب آیا۔ میں اُس کی طرف بڑھی! اور میں نے اس سے
منتیں کیں کہ میرے ساتھ چلے۔ وہ تھوڑی دیر ٹھٹکا، چاروں طرف دیکھا۔
اس تنگ مقام سے خشک میدان کی طرف اور اس کے بعد جنگل کے تاریک
اور تناور درختوں کی طرف چاندنی کی روشن لکیر جا رہی تھی۔ وہ بھی اُس پر
پڑ لیا۔ میں اُس کے پیچھے پیچھے تھی۔ ہر چیز پر خاموشی اور مدہوشی طاری تھی۔
میدان میں پُہنچ کر وہ ایک بڑے درخت سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔
اور میری طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا :۔

"اے عورت! بول کیا تو اپنی زینت، اپنے حسن، اپنی جوانی کے
بل پر، کیا اس گناہِ فسوں کار کے بل پر جو روح کو پھندے میں پھنسا لیتا ہے۔
میرے دل کو پھُسلانا چاہتی ہے۔ میری روح پر اب تک کسی لذت نفس کا دھبّا
نہیں لگا ہے۔ وہ پاک وصاف ہے۔ تیری آنکھوں سے نامتناہی جذباتِ عشق

ایک نگاہِ غلط انداز کا دان اُس سے مانگوں۔ مگر وہ ہرگز ہرگز میری طرف نہ دیکھتا۔

بے نظیر ہیرے، دل رُبا یانہ سبزی سے چمکنے والے زمرد، آنکھوں کو خیرہ کرنے والی دمک کے یاقوت، وہ موتی اور جواہرات جو سنگ دل معشوقوں کو موہ لیں اور ان کی نظرِ التفات خرید لیں، یہ سب اس کی ایک نظر کے سامنے میرے نزدیک ہیچ و بے رنگ تھے۔ اس نظر کے سامنے جس سے اُس نے تمام کائنات کو آفتابِ عشق سے سوزاں و فروزاں کر دیا تھا۔ ان ہیرے جواہرات کو میں "تیتھو جی" کے مندر پر لے گئی اور دیوتا کے قدموں پر میں نے اُن کو بکھیر کر نچھاور کر دیا۔ کہ وہ اپنے پوجاری کی اک گوشۂ چشم میری طرف پھیر دے۔ ایک ذرّۂ آتش مجھے دلا دے۔ مگر میں اک نظر، اک نوازش کو بھی ترسا کی۔

گرمی کی اک شام تھی خشک زمین میں ایسے دراڑے پڑے ہوئے تھے جیسے کسی کا پیاس سے موہنہ کھل گیا ہو۔ دنیا گرمی سے کباب ہو رہی تھی اس وقت میں مندر کے دروازے پر کھڑی ہوئی اس کا انتظار کر رہی تھی زرد غبار سے آسمان ایسا سنہری گنبد معلوم ہوتا تھا۔ جو گرمی سے پگھل رہا ہو۔ اس سنہری گنبد میں وہ چاندی کی آنکھیں ایک ایک کر کے

آنکھوں کی چمک میں بلا کی حرارت تھی۔ اس لمحہ میں اس کی روح کی سیاہ چمکدار کھڑکیوں میں سے میری روح کے بار دنقطہ پر ایک آفتابِ عشق طلوع ہوا اور اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اس جہنمی اقلیم کے تمام ذرّات میں ایک مونست پیدا ہوگئی۔ آسمان اپنے ستاروں کے ساتھ، فضا اپنی نامتناہی طول کے ساتھ زمین اپنے جنگلوں، اپنے ذی روح مخلوقات، اپنے تمام شاندار دریاؤں اور پہاڑوں کے ساتھ بیدار ہوگئی اور میری روح میں آفتابِ عشق سے اس طرح حرارت پیدا ہوئی کہ اس کا ایک ذرّہ بھی بارد نہ رہا۔

غرض کہ مجھے ایسا معلوم ہوا۔ کہ دنیا کی ہر شے کو اور مجھے ایک روح افزا آتش گرم کر رہی ہے۔ مگر اُس نے اپنی روح سے بھیجے ہوئے شرارے سے مجھے اور ایک عالم کو حرارت دے کر اپنی روح کی کھڑکیوں کو اپنی متین پلکوں سے بند کر لیا اور نکلا چلا گیا۔ وہ تو نکلا چلا گیا۔ مگر میری زندگی اُن گرمیوں کی آتش ریز راتوں میں زمین کے گرم سینہ پر، محموم اور تپ زدہ زندگی تھی۔ دنیا کا سینہ اس عشق سے دھڑک رہا تھا جس کی درختوں اور جنگلوں میں ہر قسم کی مخلوق بستۂ فراک تھی اور اب میں بھی ہر نفس اور ہر لمحۂ حیات میں دنیا کی ہم آہنگ تھی۔ میں ہر روز مندر کے دروازے تک جاتی، تاکہ بھکاریوں کی طرح اس کی

نہ میرے حسین جسم کا حسن اور نہ اس فسوں کار اور گرم مملکت کی گرم جوشی پہنچ سکتی تھی۔

اُن جہنم کی طرح گرم دنوں میں بھی جب کہ جنگل میں ہاتھی گینڈے اور غزال اور بارہ سنگھے اور درندے آپس میں لڑنا بھول جاتے ہیں، یہ نقطہ خنک ہی رہتا۔ تمام زمین سے جس وقت شعلے نکلتے ہوتے اور آسمان سے گرم لپٹیں آ آکر تمام جان داروں کو جھلستی ہوتیں۔ میں اس نقطۂ بارد کی سردی میں ٹھٹھرتی ہوتی۔ اس لئے کہ عورت کی روح کا یگانہ آفتاب یعنی عشق میری روح پر پرتوفگن نہیں ہوا تھا۔ اس لئے کہ محبوب کی نگاہوں کے چمک دار تارے صرف جن سے عورت کے روح کی فضائے تاریک منور ہوتی ہے۔ ابھی تک سیاہ بادلوں میں چھپے ہوئے تھے۔ ایک دن میں شیوجی کے مندر میں گئی کہ اس تاریکی اور برودت کی جو میری روح پر طاری تھی اُن سے شکایت کروں اور اُن سے التجا کروں کہ وہ روشنی اور گرمی مجھے بخشیں۔ مندر کی تنہائی میں سے ایک نازک اندام نوجوان جس کی آنکھیں آتشِ سیاہ کی طرح چمک اور حرارت برسا رہی تھیں میری طرف آتا نظر آیا۔ اُس کے قیافہ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک مقدس برہمن ہے۔ میں کہہ چکی ہوں کہ اس کی

میرے تمام آہنگِ رقص میں نغمہ کار و مترنم ہو کر شریک ہوتے تھے۔ دنیا کا تمام عشق، نیچر کی تمام صنّاعی، تمام خوبصورتی میرے رقص میں کبھی جلا دینے والی کبھی مار ڈالنے والی اداؤں کے ساتھ کانپتی ہوئی نظر آتی تھی۔ پھر میرا سر اس کی ایک جنبش، ایک اشارے میں میرے سانولے جسم پر جو شعر و آہنگ کی جان تھا لمبے لمبے سیاہ ریشمی چمکدار بال بکھر جاتے تھے۔ میری آنکھیں؟ میرے ابروئے خم دار کے نیچے۔ وہ ایسی بڑی اور روشن آنکھیں تھیں جیسی اُن غزالوں کی ہوتی ہیں جو گرمیوں میں جنگل کے محفوظ ترین گوشہ میں پانی پینے کے لئے جھجکتے ٹھٹکتے آتے ہیں۔

میرے اُن مسی مالیدہ ہونٹوں میں سے جو نہایت گرم ملک میں کھلے ہوئے قرنفل کے پھول کی طرح تھے۔ صاف شفّاف موتیوں کی لڑی چمکتی تھی۔ سارا ہندوستان مجھے رقص کی دیوی سمجھکر پرستش کرتا تھا۔ میں بڑے بڑے راجاؤں کے سامنے ناچ چکی تھی۔ ناچتے وقت موتیوں، یاقوتوں اور جواہرات کی مجھ پر وہ بارش ہوتی تھی۔ کہ میرے دوپٹے کے ہر تار میں وہ پروئے جا سکتے تھے۔

مگر میں پھر بھی خوش نہ تھی۔ میری روح میں ایک بار دنقطہ تھا جس تک

فسانہائے عشق

(۱)

ہندوستان کی رقاصہ

میں ہندوستان کی سب سے زیادہ حسین رقاصہ تھی۔ میرا نازک جسم سانولا سلونا تھا۔ جس پر جزیرۂ سراندیپ کے صاف و شفاف موتی دمکتے تھے۔ میری ہر وضع ہندوستان کے چیتوں کی پھرتیلی اور بے اماں حرکتوں سے زیادہ فسوں کار تھی۔ میری بوٹی بوٹی اس زہریلے سانپ کی طرح جو جتنا زیادہ زہریلا ہو۔ اتنا ہی دل نشین طریقہ سے لہراتا ہے۔ بل کھاتی تھی میں ایک مخلوق تھی جس نے شعر حرکت کو اپنے تمام بدائع اور نیرنگی کے ساتھ اپنے جسم میں جمع کر رکھا تھا۔ میرے ننگے پاؤں کے گھونگرو میری ہر ٹھوکر پر، میرے کبھی گرے، کبھی اٹھے ہوئے ہاتھوں کے بازوبند

نشوۂ خمار نے فریفتہ کر دیا۔ میدان پاکر پینا شروع کر دیا۔ یہی ہوتا ہے
بات پہلے ہی مرتبہ کے نہ پینے میں ہے۔ اُس کے بعد کچھ نہیں ہوتا۔
جوان اُس وقت سے اپنی زندگی زہریلی کر رہا ہے۔

کر رہے تھے۔ مگر وہ پیالہ ہاتھ میں نہ لیتا تھا۔ چہرہ پہ توجاتِ کراہت اور حسیاتِ نفرت ظاہر ہوتے تھے۔ مگر افسوس زبان سے نہ کہتا تھا۔

تردد و خلجان و پریشانی کے ساتھ ہاتھ میں پیالہ لیا گیا۔ ایک لرزشِ خفی تمام جسم میں دوڑ گئی جیسے بڑی سردی معلوم ہو رہی ہو۔ اس طرح کہ اُس کے دانت بجنے لگے۔ بڑھایا ہوا ہاتھ بے اختیار پیچھے ہٹ گیا۔ اصرار اور رِجانے اس دستِ متردد کو پھر بڑھایا۔ مگر مُنھ تک لے جانے کی حالت میں یکایک پھر ٹھیر گیا۔ اختلاجاتِ وجدانیہ کی تاب نہ لا سکا۔ اور کہا "پی نہ سکوں گا"۔ مگر ابھی پیالہ ہاتھ میں ہے۔

کیا جانئے کیا ہوا؟ دو معنی دار نظروں نے اُسے گھور کے دیکھا اور پیالہ خالی کر دیا گیا۔ اُس کے جسم میں ایک حرارت آئی اور اُسے اپنے اوپر اختیار نہ رہا۔ دوسرے پیالہ نے حرارت میں تخفیف کی۔ شیشہ خالی کیا گیا۔ اور اب اُسے نشوۂ مستی کا احساس ہوا۔

کیا تم یقین کرو گے؟ متاسّف ہے۔ آیا پینے سے؟ اور شاید اس وجہ سے کہ اچھی جگہوں میں نہ پی اور پی تو یہاں!

جوان کانپ اُٹھا۔ بارونق و مکلف عشرت گاہوں میں جب ایک قطرہ مُنھ میں نہیں ڈالا تو اس مردار و نفرت انگیز مقام میں کیوں کر پی سکے گا؟ اس آبِ زہرناک کو جو گہری کائی میں دبے ہوئے پیپے سے نکل رہی تھی کیوں کر اپنے معدہ میں اُتار سکتا تھا؟ غرض کہ جوان کی حالت ایسی ہوگئی کہ گویا وہ ہرگز نہ پیئے گا لیکن ۔ ۔ ۔ لیکن بات دے چکا تھا۔ اب کیا ہو سکتا تھا؟ اپنی بات کی سچّائی پر کبھی اُس نے تکرار کی تھی؟ اب اُس کے خلاف اُس کے امکان سے خارج تھا۔ خیر خیر نہ پیئے گا! اس آبِ زہرناک کو مُنھ میں نہ ڈالے گا۔

خدمت گار نے اپنے ناپاک ہاتھوں سے اُن کے بیچ میں قدح اور شیشے رکھنے شروع کئے۔ اس بیت العشرۃ، اس دار الخبائث میں پینے سے مزہ کیوں کر آسکتا تھا؟ جوان نے پھر سب کی طرف دیکھا۔ اتنے میں ایک تیز آواز نے کہا "پانی لاؤ"۔ یہاں پانی کہاں؟ یہاں پانی سے مراد لوازمِ نوشانوش ہیں۔ جوان کسی طرح اپنے رفیقوں میں شریک نہ ہو سکتا تھا اور وہ "آپ کی صحت"، "آپ کا شرف" کہہ کہہ کر اصرار

داخل ہوئی۔ یہ مے خانہ نہ تھا بلکہ مزبلہ گاہ معلوم ہوتا تھا۔ چھت بغیر چمنی کے لمپ کے دھوئیں سے بالکل کالی ہوگئی تھی۔ ہر کونے میں مکڑی کا ایک بڑا جالا بنا ہوا تھا۔ زمین ایک بالشت گہری کیچڑ میں دبی ہوئی تھی۔ میز کی جگہ پر ایک پرانا مستعمل مٹی کے تیل کا صندوق رکھا ہوا تھا جو تختہ کہ کوچ کا کام دے رہا تھا اُس پر ایک متعفن کریہ المنظر ٹاٹ (جس نے نہ معلوم کس وقت سے پانی کا منھ نہیں دیکھا تھا) پڑا تھا۔ شیشے، برتن، پیالے میل کی وجہ سے نظر نہیں آتے تھے۔ تین چار بلانوش ایک میز کے گرد احاطہ کئے ہوئے پے درپے پی رہے تھے۔ یہ بھی اس زمرۂ بدمستی میں داخل ہوگئے اور جاکر بیٹھ گئے۔

جوان نے ایک لمبی اور اسرار انگیز نظر سے چاروں طرف دیکھا۔ پھر ایک معنی دار نظر اپنے ساتھیوں پر ڈالی اور کانپ کر پوچھا:۔

"یہاں کیا ہوگا؟" جواب ملا "عیش و طرب"

جوان نے ایک قہقہہ لگایا اور اُس کی آنکھوں میں ایک برقِ تہوّر چمکی۔ اُس نے پوچھا۔ "پھر؟"

جواب دیا گیا۔ "پیئیں گے۔"

"یہاں؟" "ہاں"

وہ عجیب عجیب خط لکھتا تھا۔ جن میں لذتِ اشتغال، محظوظیتِ خدمت نشوۂ آرام سے بحث ہوا کرتی تھی۔

انسانی طبیعت کا مختلف زمانہ میں مختلف حالتوں میں ہونا کیا کیا تبدلات پیدا کرتا ہے۔ آج جو غضب و تکدر اور اندیشوں میں ڈوبا ہوا ہے وہی کل نشوۂ و خندہ و بہجت سے ہم آغوش ہے۔ جو شخص ابھی حیاتِ سفیلانہ سے متنفر ہے تھوڑی دیر بعد سفالت کے درجہ سے بھی نیچے پڑا ہوتا ہے۔ ابھی جو اصلاحِ نفس سے بحث کر رہا ہے کچھ تعجب نہیں جو کچھ عرصہ کے بعد وہی قعرِ معاصی میں گرا ہوا ملے۔ یہ محقق ہے۔

جوان کا بھی یہی حال ہوا۔ اُس کی اُلجھن رفع کرنے کے لئے اُس کے چند دوست نما دشمنوں نے صلاح دی۔ کہ شراب پیو۔ نوجوان اُس کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ بدمست لوگوں کے احوال رذیلانہ دیکھ کر اُسے شراب سے نفرت دائمی ہوگئی تھی۔ اب کس طرح پی سکتا ہے۔ یہ ہرگز نہ ہوگا۔

افسوس اس ارادہ پر ثابت قدم نہ رہا اور اُن دوستوں کے اصرار کو رد نہ کر سکا۔ اُن کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا اور یہ سب لوگ سیتجی قہوہ خانے کے سامنے والے مے خانہ میں گئے۔ پہنچتے ہی اُس کے دماغ میں ایک کریہہ بو

سب پڑوسی نوجوان کے انجام سے ڈرتے ہیں۔ اُس کی اصلاح کے متعلق اُس کی ماں سے سوال کرتے ہیں۔ مگر افسوس ماں بچاری کیا کرے۔ وہ نصیحت سنتا ہی نہیں۔ ہم کہہ نہیں چکے ہیں کہ وہ ہوا و ہوس سے مغلوب ہے۔ اُس کو اُس کے مشاغل سے باز رکھنا سخت مشکل ہے۔ ہوس نے اپنا سکّہ جما رکھا ہے۔ بُرائیاں حکمرانی کر رہی ہیں اور طالع مساعد ہے اور کامرانی زیادہ۔ جوان کو ماں نے ایک تقریب سے دوسرے شہر میں بھیج دیا کہ شاید اسی ذریعہ سے اُس کی آشفتہ مزاجی میں کمی ہو۔ وہ چلا گیا۔ مگر کیا اُس کی حرکاتِ مجنونانہ میں کوئی کمی ہوئی؟ غلط غلط تخفیف نہیں ہوئی۔ بلکہ ایک عارضی سکون نے اُس کے دماغ کو خواہشاتِ نفسانی کی طرف سے سکتہ میں ڈال دیا اور امورِ معیشت کیا چیز ہیں اور حیاتِ ساعیانہ کسے کہتے ہیں۔ یہ اُسے بتانا شروع کیا۔ اُس کی خواہشیں زائل نہیں ہوئیں۔ صرف ذرائع مفقود تھے۔ حیاتِ ماضی اُس کے تخیل سے وابستہ تھی۔ ہاں کبھی کبھی یہ بھی خیال دل میں جاگزیں ہو جاتا تھا کہ گناہ کس قدر آرام سوز اور طاقت فرسا ہیں۔ ان خیالات سے اُس کی پریشانی اور بھی بڑھ جاتی تھی۔ مسائل مہمۂ حیات پر غور کرنے سے اُس کی حالت بحران تک پہنچ جاتی تھی اور اس زمانہ میں بالکسی کو بھیجنے کے ارادے کے

میں مبتلا ہوں گے اس سے اپنے دماغ کو تکلیف نہیں دیتا۔ اگر وہ پریشان ہیں تو میں کیا کروں؟ میں بچہ نہیں ہوں، اگر غیر حاضر رہتا ہوں: رہنے دیں۔

وہ شفقت پناہ عورت جسے ماں کہتے ہیں۔ آنکھوں میں آنسو بھر کے اُس کی خوشامد کرتی ہے۔ وہ بھی تین چار منٹ کے لئے متاثر ہو کر اپنی حالت پہ افسوس کرتا ہے مگر پرانی ہواے محبت اس نقش کو بہت جلد زائل کر دیتی ہے۔ وہی فکر، وہی مشرب اپنی فرمان روائی پھر شروع کر دیتے ہیں۔ جو شخص کہ چند ساعت پہلے اپنی والدہ کے حضور میں محجوبیت اور ندامت کے ساتھ حاضر تھا اب وہی اپنے پرانے شبانہ اشغال میں شریک ہونے کے لئے موجود ہے۔ شام کو دستر خوان کے گرد جمع شدہ خاندان میں ایک شخص کی عدم موجودگی کیسی عمیق سکوت کا باعث ہوتی ہے۔ والدہ پریشان اور اندیشہ ناک نظروں سے جگر پاروں کو دیکھتی ہے۔ بڑے بھائی کی غیر حاضری کی وجہ سے دلگیر ہو کر چھوٹے چھوٹے بچے بھائی کے معصومانہ سے کہتے ہیں (" اماں! ہم کھائیں بھائی تو آئے نہیں") بغیر کسی لطف اور لذت کے پیٹ میں کھانا ڈال کر علحدہ ہو جاتے ہیں۔

چاہتا ہے۔ غرض کہ وہ بزم آرا و شوق افزا ہے۔

ناتجربہ کاری اور بے فکری کے خیالات رات دن اُس کی خدمت میں فخر کے ساتھ حاضر رہتے ہیں۔ اس میں تعجب کیا ہے؟ جوانوں کے لئے دل لگی چاہیئے۔ وہ بھی اپنا دل بہلاتا ہے۔ وہ بھی روایت پرور افکار کا محکوم ہے۔ کچہری ہفتہ میں صرف دو تین دن جاتا ہے۔ باقی تمام وقت لایعنی اشغال میں صرف کرتا ہے اور ہر جگہ ایک مجوبہ سودا انتمار کھتا ہے۔

وہ خوش ہے۔ زندگی کے مسائلِ مہمہ میں سے ایک بھی اسے اپنی طرف نہیں کھینچتا۔ اندیشہ و اضطراب سے بری ہے۔ مستقبل زمانہ کا ذرا بھی خیال نہیں کرتا۔ حال میں اپنی عمر کو ایک آہنگِ عاشقانہ کے ساتھ گزارتا ہے، کھاتا ہے پیتا ہے اور پہنتا ہے۔ معیشت نے اس آوارہ مزاج پر اپنا دستِ تغلب نہیں ڈالا۔ اپنے خیال میں وہ گویا اس سوچ میں ہے کہ حیات مسعودانہ کب اور کس طرح منتظم کرے۔

محاکماتِ فکریہ اور مناقشاتِ وجدانیہ کو محکومِ تعب اور آرام سوز سمجھ کر اُن سے کلیتہً مجتنب ہے۔ ہفتے یکے بعد دیگرے گزرے جاتے ہیں اور وہ گھر میں نہیں آتا۔ گھر والے اس غیر حاضری پر کس اندیشہ و خلجان

نشہ کی پہلی ترنگ

جوان[1]! بیس سال کا جوان ہی۔ وہ گردبادِ حیات، تاثّراتِ روحانیہ، سرزنشِ وجدان کس کو کہتے ہیں۔ اس سے بالکل بے خبر ہی۔ حظوظِ نفسانیہ میں شدت سے منہمک اور ہواؤ ہوس سے مغلوب۔ جہاں بزمِ عیش دیکھی اُدھر ہی کو دوڑنا۔ کہیں آہنگِ طرب سُننا۔ اُسی میں شریک ہونا، جہاں معلوم ہوا کہ کوئی مجلسِ مستانہ ہی وہیں کے ہوئے۔ مگر وہ شراب نہیں پیتا اور اسے آبِ زہرناک تصور کرتا ہی۔ صرف سوسائٹی اور یارانِ جلسہ میں رہنے کا بہت شوق ہی اور کھانے کا تو دشمن ہی۔ رکابی میں کسی چیز کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔ ہر دل عزیز ہونے کی بہت خواہش ہی اور ہر شخص کے ساتھ ملاطفت سے پیش آنا

---

[1] ترجمے میں حتی الوسع ترکی زبان کے طرزِ بیان اور ترکیبِ عبارت کا خیال رکھا گیا ہی۔

اُس پر نثار کی تھی اور کر رہی تھی، ایک مقاومت سوز انجذاب سے کھینچا۔ اُس وقت اس کی آنکھ کھلی تو اُس نے دیکھا کہ وہ ان سفید تاروں کو چوم رہا تھا اور مشرق سے شعاعِ نور کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔

بیوی سو رہی تھی، اور اس کے چہرے پر ایک ایسی معصومیت اور مظلومیت کی ادا تھی جو اس گریزاں خاوند کو بھی اپنی طرف کھینچے بغیر نہ رہی۔

اس کی خاموش مگر دائمی محبت، اس کا فتنہ زا مگر موقت اظہار الفت اس کا چھوٹی چھوٹی چیزوں پر بے زبان اظہار احسان، اس کا طلب زر و طلب تحائف کا نہ تھمنے والا طوفان، اس وقت کہ تمام گھر میں سناٹا تھا، صرف کمرے کی بڑی گھڑی کھٹ کھٹ کر کے جاگنے کا ثبوت دے رہی تھی اور وہ جاگ رہا تھا۔ بیوی کا اور اس کا جس سے لڑ کر آیا تھا طرزِ عمل اپنے اصلی رنگ میں اور اپنی متضاد کیفیت کے ساتھ اس کی آنکھوں میں پھر رہا تھا کہ اس کی نظر اس کے بالوں پر پڑی جو تکیے پر بکھرے ہوئے تھے اور اسے چند تار سفید نظر آئے۔

یہ تار ہائے سفید! قدرت نے یہ نورانی رسن بھیجی تھی کہ اسے سیاہیوں میں سے، تاریکیوں میں سے نکال لائے، وہ اپنی رفیقہ کی طرف جس نے اپنا چودھویں برس کا بالپن اور اس وقت سے ساری زندگی

مایوسیوں اور بے بسیوں میں اُسے زندگی پر مائل کرنے والی اس کی لڑکی ہی تو تھی، اگرکہیں وہ بھی نہ ہوتی تو؟ ـــــــــ

اُس کی آنکھیں لڑکی کی تعقیب کر رہی تھیں کہ اس کا دل ایک حسِ تضرّع سے بھر اُٹھا اور اُس نے مُنھ پھیر کر اور ہاتھ اُٹھا کے اپنی بیٹی کی زندگی کی خوشی کے لئے دعا مانگی۔ پھر اس کے سینہ میں ایک آہ خسران پیدا ہوئی اور وہ کمرے میں ٹہلنے لگی۔ یہ چند گھنٹے کی حیات تعب و اضطراب اس پر اپنا اثر کئے بغیر نہ رہی اور وہ ایسی تھکی کہ آج اُس کے آنے کا بھی انتظار نہ کر سکی اور سو گئی۔

وہ، حسبِ معمول، بہت دیر کے بعد آیا اور اپنی بیوی کی مدد کے بغیر کپڑے اُتار کے لیٹ گیا۔ مگر اس کی نیند پریشان تھی۔ خلافِ معمول وہ آج بیوی سے پہلے اُٹھا اور جس کبیدگی سے سویا تھا اس کبیدگی ہی سے اُٹھا۔ وہ اس دوسری سے لڑ کر آیا تھا۔ اس لڑائی نے وہ جادو کا خمار جو اس دوسری کی محبت کا اس کی آنکھوں میں بھرا تھا اُتار دیا۔

یہی لوگوں نے کہا تھا۔ مگر اس وقت کون یقین کرتا تھا؟ اسے سوچ کر، ایک آہ کھینچ کر کہتی ہے :-

"آہ! کم عمری!" لیکن کیا تمام بیاہی زندگیاں ایسی ہی تھیں؟ بے شبہ زیادہ تر خوش زندگیاں تھیں مگر جب اُس کے نصیب ہی میں یہ نہ ہوا تو ......

یہ سوچ رہی تھی کہ باغ سے آتی ہوئی لڑکی کی آواز سُنی۔ اس وقت اُس کے دل میں اس کے دیکھنے کی احتیاج پیدا ہوئی اور وہ کھڑکی کی طرف دوڑی اور دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کے لطیف و دل کش قد نے اس لڑکی میں جس نے ابھی عمر کے چودہ سال بھی پورے نہیں کئے تھے ایک ایسی پُرمحبت و پُراِل نوجوان لڑکی کی کیفیت پیدا کر دی تھی کہ اُسے دیکھ کر ماں کے دل میں ایک شیریں حسّ افتخار پیدا ہوا اور یہ خیال کر کے وہ تسلّی ہوئی کہ جس ماں نے ایسی جوان اور خوبصورت لڑکی پائی اس کا خوش قسمتی میں ضرور تھوڑا سا حصہ ہے۔ اس کے سوا اس کی اور کیا تسلّی تھی؟ اُسے زندگی سے مربوط کرنے والی اور ان تمام

جائے اور .... اپنے دل کا درد اُسے سُنائے اور ممکن ہو تو اُسے آیندہ کے متعلق خبردار کرے۔ مگر کیا فائدہ؟ وہ بھی اسی کی طرح، تمام نوجوان لڑکیوں کی طرح، وہی خواب دیکھ رہی ہوگی۔

دُلھن بننا! یہی پری خیال تمام نوجوان لڑکیوں کے خوابوں میں آتی ہے۔ کیا خود اُسے، ایسی پری نے کنوارپن میں مسخر نہیں کر لیا تھا؟ کاش اُسے خبر ہوتی کہ جن خوشیوں کو انسان دائمی خیال کرتے ہیں اُن میں اتنا مدت بھی ایک حظِ عظمت حاصل نہیں ہوتا جیسا کہ ایک سرائے سے جو خواب میں دیکھا جائے حاصل ہوتا ہے۔ مگر اصل حماقت، زندگی میں کسی دائمی خوشی کے موجود ہونے کا یقین کرنا ہے۔ اسے اب سمجھتی تھی بلکہ ابتدا ہی میں سمجھنے لگی تھی۔ بے شبہ، تمام نوجوان لڑکیوں کو بھی یہ علم ہو کر رہے گا لیکن کس وقت؟ جب کہ ہر چیز ختم ہو چکی ہوگی اور زندگی کے ہر قسم کے نیک و بد احتمالات کے مقابلہ میں سوائے سرِ تسلیم خم کرنے کے اور کوئی چارہ نہ ہوگا۔ ایک وقت اس سے بھی

خاوند کی وجہ سے آنسو بہا رہی ہے۔ وہ ہر چیز سے بے پروا، بے خبر، نہ معلوم کس
ہوائی آرزو کے تعاقب میں پھر رہی ہے۔ جب وہ نوجوان لڑکی تھی تو کیا خود وہ
ایسی ہی نہ تھی؟ اس وقت اس کی آنکھوں میں وہ زمانہ پھر گیا جب بیاہ ہونے تک
وہ ماں باپ کے مہر آمیز تعیدات میں، ہر قسم کے فکر و اندیشہ سے آزاد، کنوارپن
کی آرام بھری زندگی بسر کرتی تھی۔ وہ لڑکی جس پر تمام گھر بھر نثار ہوتا تھا آج
چار دہ سالہ لڑکی کی ماں بن کر ایک بدبخت متروک بیوی ہے جو غم و غصہ سے
سوکھ گئی ہے اور بال سفید ہو گئے ہیں اور اس خوشی کی جس کی قیمت اس وقت
نہ جانی، یادِ بعید سے اس وقت محزون ہو رہی تھی۔ آہ اس وقت اُس نے
بیاہ کی کیسی تمنائیں کی تھیں اور بیاہ کی زندگی سے کیا کیا اُمیدیں کی تھیں۔
اب وہ تمام اُمیدیں خالی جانے پر، اپنے دل سے کہنے لگی:۔

"آہ! میں کس قدر دھوکے میں تھی!"

اور اس زندگی کی جس کی حقارت کی تھی، اس وقت وہ تقدیس کر رہی
تھی۔ کاش اگر وہ زندگی پھر مل سکتی تو اُس کے واسطے ہر چیز فدا کرنے کے لئے
تیار تھی۔ اب پھر اس کا خیال اپنی بیٹی کی طرف گیا۔ اس خوف سے کہ کہیں
اس کی بھی قسمت اس کی طرح نہ ہو کانپ اُٹھی اور اس کا ارادہ ہوا کہ فوراً

وہ اس میں مشغول تھی کہ اس کی لڑکی کی لطیف و پرنشہ آواز نے اچانک اُسے گویا ایک خواب سے بیدار کیا۔ اس آواز نے اُسے اُس کابوس سے جو اُس کی مجادلات روحیہ میں اس کے قلب کو گھونٹ رہا تھا۔ چھڑایا اور اُس نے ایک لمبا سانس لیا۔ لڑکی نے آج کپڑے بدلے تھے اور اس کی خوشی میں وہ دوڑی دوڑی آئی اور گو چودہ برس کی تھی مگر بچپن کی در آغوش طفلانہ سے اپنی ماں کو لپٹ گئی۔

ایک ایسے استفسار سے جس میں یہ یقین شامل تھا کہ اس کی آرزو فوراً پوری کی جائے گی اُس نے کہا "اماں جان، چلئے پائیں باغ میں جھولا جھولیں" "بیٹی اب مجھے تو کام ہے" وہ اس پر ٹھنکنے لگی! اس پر اُس نے اپنے اعتیاد قدیم کے خلاف، اسے سوسن کے ساتھ جھولنے کی اجازت دی۔

لڑکی جس وقت کمرے سے نکلی تو ماں کے دل میں ایک حسرت پیدا ہوئی۔ کاش وہ بھی اسی طرح چونچال؛ زندگی کے تمام تاثرات آلام کے مقابلہ میں بے پروا لڑکی ہوتی۔ یہ لڑکی! وہ اس فلاکت سے بھی بے خبر تھی جو اس گھر میں طاری وساری تھی۔

ہنستی ہے ٹھنکتی پھرتی ہے اور اس کی ماں، بیوی بچے چھوڑ دینے والے

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے کو تھی۔

تو یوں کہیے کہ وہ بڈھی ہو رہی تھی، اس کے بعد روز بروز وہ بوڑھی ہوتی جائے گی اور جوں جوں سفید بال زیادہ ہوتے جائیں گے وہ اس گڑھے کے ایک قدم اور نزدیک ہوتی جائے گی، زندگی کے ایامِ مسرت اب گویا روز بروز دُور ہوتے جائیں گے اور وہ اپنی جوانی کا جو غائب ہوئی جارہی تھی ماتم کیا کرے گی، زندگی کی تمام اُمیدیں اس کے لئے بے معنی الفاظ تھیں اس کا خاوند اب اُسے نہ چاہے گا اور روز بروز اُس بُڑھیا بیوی سے دُور ہوتا جائے گا اور اس میں وہ حق بجانب بھی ہوگا، اس لمحہ میں اپنی جنس کی تمام یاس و بیچارگی کے ساتھ اُس نے قضا و قدر کے اس تلخ جلوہ کے سامنے اپنی گردن جھکا دی اور اپنی بدبختی پر خود ہی رحم کھانے لگی۔

لیکن وہ پھر بھی سالہا سال سے ان ستموں میں پسی جانے کے باوجود تازہ شگفتہ تھی، آئینہ میں اپنے چہرہ پر جو سالہائے دراز کے قہر و الم اُٹھا کر بھی اپنی دلبری قائم کئے ہوئے تھا نظر ڈالتے وقت اُسے ایسی دل کشی کی علامتیں نظر آئیں جس سے وہ اپنے خاوند کو اس تغافل میں قابلِ الزام قرار دے سکتی تھی اور اس سے ایک بڑا اطمینان اُسے حاصل ہوا،

اپنے تیئں اُس پر ترجیح دینے کے اتنے جہات پاتی ہی کہ اس کا غرور نسوانی جوش میں آتا ہی اور وہ اتنا کہنے کی اپنے میں قوت حاصل کر لیتی ہی کہ "اُسے اچھی شکل پہچاننے کی تمیز ہی نہیں"۔ اس میں علاوہ اس کے کہ وہ خوب صورت تھی ایک دوسری ممتازیت بھی تھی کہ اس ممتازیتِ عفیفانہ کے مقابل میں باقی تمام چیزیں قابلِ سقوط تھیں۔ پھر اپنے خاوند کو اپنے حسن اور اپنی عفت کے ساتھ اپنی روح، اپنے عورت پن کی سب سے زیادہ پاک، سب سے زیادہ صاف ہستی کو دے چکی تھی اور اُس سے کوئی شخص اس قدر مربوط نہیں ہو سکتا تھا مگر افسوس اس کی قدر نہیں کی جاتی تھی، تو گویا یہ سب خوبیاں بے فائدہ، تمام رائیگاں تھیں!

اس کی حیاتِ ازدواج کا یہ نتیجہ مقدرہ اس کے ذہن کے سامنے آتا ہی وہ متاثر ہوتی ہی اور آئینہ میں اپنے عکس کو دیکھ کر اپنے اوپر ترس کھاتی ہے، یکایک اپنے سر کے بالوں میں ایک سفید تار اُسے نظر پڑا، اور اس اول نشانۂ خرابی نے اس کے دل کو مسوسا، اُسے وہاں سے اُکھاڑتے وقت اُس کی اُنگلیاں کانپ رہی تھیں، اس کے بعد دو ایک سفید تار اور جو نظر آئے تو اس کے دل میں ایک حقیقتِ الم ناک کے متعلق ایک ایسا یقین مایوسانہ پیدا ہو کہ

معلوم نہیں کیسی دیوانہ وار محبت سے چاہتا ہو گا اور یہ سوچتے سوچتے اُسے ضعف محسوس ہوتا یہاں تک کہ وہ سوچنے سے بھی عاجز ہو جاتی، آہ! یہ عورت کیسی جادو بھری قوت کی مالک تھی کہ ایک مرد کو اُس کے تمام علاقوں سے جدا کر کے اپنے قبضہ میں لا سکتی تھی، ضبط کر سکتی تھی، حیاتِ ازدواج میں تو اُسے ایک دن بھی یاد نہیں پڑتا جب کہ وہ خاوند پر تحکم کر سکی ہو، اپنی حیاتِ معاشقہ میں بھی وہ کبھی اتنی سحار نہ تھی لیکن خود وہ اُسے ہمیشہ دیوانہ وار چاہتی رہی تھی، اس سے اُس نے ایک نظریہ قائم کیا:-

"یقیناً وہ عورت اُسے نہیں چاہتی"

کیوں کہ دیکھ رہی تھی کہ چاہنے والا چاہا نہیں جاتا اور اس بنا پر تمام نوعِ انسان پر تہمت لگا کر اُنھیں قابلِ مواخذہ خیال کرتی تھی، اس کے بعد اس کا فکر ایک دوسری جانب منتقل ہوا: شاید یہ عورت خوب صورت بھی نہ تھی آئینہ میں اپنی صورت ایک نکتہ چیں کی نظر سے دیکھتی ہے اور یہ خیال قوت پکڑتا ہے، اپنے تئیں اس سے زیادہ خوب صورت ثابت کرنے کے لئے اپنے ذہن میں اپنا اور اُس کا مقابلہ کرتی ہے اور اس عورت کو گھٹانے کے لئے عجیب عجیب نقطے پیدا کرتی ہے۔

ساتھ خیانت کر رہا تھا، ایک دوسری کو چاہ رہا تھا، گھر کی پاکیزگی سے نکل کر ایک سفیہ عورت کی آغوشِ لوث و ریا میں خوشی تلاش کرنے کے لئے انسان کو کس قدر احمق ہونا چاہیئے؟ ... ... اس کے بعد اس کے ذہن میں ایک شبہ پیدا ہوا: شاید وہ عورت اس سے زیادہ خوب صورت تھی، اس وقت اس کے چہرے کا عکس جو آئینہ میں پڑ رہا تھا اُسے ایسا معلوم ہوا کہ اُسے ایک مستہزی نظر سے دیکھ کر کہہ رہا ہے: ہاں وہ تجھ سے زیادہ خوب صورت اور تجھ سے زیادہ جوان ہے، اِس سے اُس کے دل میں ایک زخم لگا اور وہ سوچنے لگی کہ اس کا خاوند اس عورت کی کسی تاثیر جاذب کے زیر حکم و نفوذ ہوگا اور اس خیال سے اس عورت کے خلاف جس نے اس کے خاوند کو اس کے ہاتھ سے چھین لیا اس کے دل میں اک گہری خصومت پیدا ہو رہی تھی، اگر ممکن ہوتا تو وہ جاتی اور اُسے اس کے بالوں سے پکڑ کر کھینچتی اور اس دشمن کو جس نے اس کی تمام خوشیوں کو زہر آلود کر دیا تھا سانپ کے سر کی طرح کچل دیتی۔

اب اُس کا قلب زور سے دھڑک رہا تھا اور وہ تصورات کا شکار ہو رہی تھی کہ ایک اور خیال نے اُسے مایوس کیا، اُس کا خاوند، اُس عورت کو

آئینہ کے سامنے پہونچی اور اُسے غبار سے صاف کرنے لگی، آئینہ کے مقابل ہوئی تو اُسے خیال آیا کہ وہ اس قدر بڈھی تو نہ تھی، یہی نہیں بلکہ اُس کا لمبا قد، بھرا ہوا سینہ، نشیلی آنکھ، سر پر بکھرے ہوئے سیاہ بال (جن کا ابھی جوڑا نہیں باندھا گیا تھا اور جو گویا سیاہ لہریں تھیں) اُس کا چھوٹا منھ، اُس کی گوری جلد جس کی طراوت ابھی غائب نہیں ہوئی تھی، غرض کہ سب چیزیں ابھی اس قدر حسین تھیں کہ وہ چاہے جانے کے قابل تھی، اس کی نظروں میں ایک ایسا خمار تھا کہ انسان کو مست کر دیتا تھا، اور اس کی سیاہ گھنی اور لمبی پلکوں میں سے نکل کر آنے والی نگاہ ایک ابدی عشق کی مدہوشی پھیلاتی تھی، غرض کہ اس کے عورت پن کی روح، اُس کی تمام رقت اور جاذبیت اُس کی نشیلی آنکھوں کے اعماقِ مدہوشی میں آ کر جمع ہو گئی تھی، جسے دیکھتے دیکھتے انسان کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ خواب میں کسی سراب میں پیر رہا ہے، وہ سادہ دل تھی اور آئینہ سیما، اور چہرے پر ایسی تازگی تھی اور اُس کے حسن میں ایک ایسا رقیق جاذبۂ سحر تھا کہ انسان کو اُسے بیس سال سے زیادہ کا خیال کرنے میں تردد تھا۔

وہ اس قدر جوان شکل اور خوب صورت تھی، پھر بھی اُس کا خاوند اس کے

اُس نے اوّل اس سوال کو بچّوں کا سا سمجھا' اس سوال کو سن کر وہ مسکرایا' لیکن اصرار پر اُس نے اسے یقین دلایا : کہ جتنا وہ سمجھتی تھی اُس سے زیادہ وہ اُسے چاہتا تھا اور تا ابد زوال ناپزیر محبت سے وہ اُسے چاہے گا اور پھر قسم کھا کے کہتا تھا "مرتے دم تک میں تیری پرستش کروں گا۔"

وہ ان تمام نوحات سودا یا نغماتِ الفت کو جو ایک پرُ حرارت قلب سے نکل رہے تھے ایک عمیق مسرت کے ساتھ کانوں سے پی رہی تھی اور اسی لمحہ میں اُس کے چھوٹے سے دماغ میں ایک دوسرا سوال پیدا ہوا جسے اُس نے پوچھا :

"جب میں بڈھی ہو جاؤں گی تب بھی ؟"

اس پر اس نے قسموں کا تار باندھ دیا'

تو کیا یہ سب جھوٹے تھے ؟ زندگی ! کیا وہ جھوٹ سے عبارت نہ تھی ؟ اسے جانتی تھی اور پھر بھی دھوکا کھا رہی تھی' اور اس وقت تک دھوکے ہی میں رہی تھی' آہ' انسان اگر فریب خوردۂ آرزو نہ ہو تو یہ بدبخت مخلوق کس طرح تسلی پائے اور کس طرح جئے ؟

اس وقت کہ کمرے کی چیزوں کو درست کر رہی تھی ہاتھ میں اک کپڑا تھا کہ

کہیں کسی کی نظر نہ داخل ہو گئی ہو اور وہ خواہ مخواہ دروازے کو بند کر دیتی،
رات کو سونے کے وقت اس کمرے کا خود ہی دروازہ کھولتی، خود ہی لیمپ
جلاتی اور اس وقت اُسے اطمینان ہوتا کہ وہ کسی غیر جگہ میں نہیں ہے اُس کے
عورت پن کا یہ ایک عجیب جس تھا کہ اس کمرے سے باہر جس میں حیاتِ ازدواج
کی پہلی رات اُس نے بسر کی تھی۔ اس کے قلب میں ایک اجنبیت، ایک غیر محرمیت کا
احساس پیدا ہوتا۔ اس وقت یہاں اس کمرے میں ان چھوٹے چھوٹے کاموں
میں مشغول تھی، ایک چھوٹی سی چیز نے جس کی طرف کبھی اُس کا خیال بھی نہ گیا تھا
ایک یادِ بعید اُس کے دل میں پیدا کر دی اس یاد کو زندہ کرتے وقت جو ایک
رجعتِ فکریہ کے ساتھ سیدھی بیس سال پہلے کی ابتدائی، پُر لطف ماضی کی طرف
لے گئی۔ اپنے لڑکپن کی ایک حکایت محبت کے تمام صفحات شعر و معاشقات
اس کی نظر کے سامنے آ گئے، اس وقت شاید وہ چودہ برس کی تھی، گرمیوں
کی چاندنی رات تھی، وہ دونوں (یا زیادہ صحیح یہ کہ خود وہ گجروں اور پھولوں
میں لدی پھندی) چھت پر ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بیٹھے ہوئے تھے کہ اس نے
یکایک اس سے پوچھا:

"کیا تم حقیقت میں مجھے بہت چاہتے ہو؟"

ممنون ہونے کے اُس سے جلتی تھی، ہاں ہر چیز میں، اپنے خاوند، اپنے گھر، اپنی محرمیت حتیٰ کہ چھوٹے سے چھوٹے کام میں جو اُس سے متعلق ہوتا وہ دوسرے کی شرکت سے رشک کرتی، اس رشک نے سالہا سال سے اُس میں مفرط عصبیت کی وجہ سے ایک ایسا احساس مریضانہ پیدا کر دیا تھا کہ ذرا ذرا سی بات پر بگڑ جاتی اور تنک مزاج عورت بن جاتی۔

اُس کا سب سے زیادہ محرم گوشہ اُس کا کمرہ تھا، اُس میں ایک منٹ کے لئے بھی کسی نامحرم کے سائے کے بھی داخل ہونے کی روادار نہ تھی، داخل ہونا تو علٰحدہ رہا اُس میں کسی کا باہر سے نظر ڈالنا بھی اُسے گوارا نہ تھا۔ اس کے کمرے کی کل چیزیں گویا اس کی محرم راز تھیں اور وہ اُن میں سے ہر ایک کی عزت کرتی تھی اور حیاتِ ازدواج کی چھوٹی سی چھوٹی یادگار کو بھی قابلِ پرستش سمجھتی تھی، وہ خیال کرتی تھی کہ یہاں، اس حریم اسرار میں جو عصمت مآب محبت انتساب یادگاروں سے بھرا ہوا تھا اگر کسی غیر کی نظر پڑی تو وہ یادگار اُسے بھی معلوم ہو جائے گی اور وہ کونے جنھیں مکتوم رہنا چاہیئے مکشوف ہو جائیں گے اور وہ صمیمیت جو اب وہاں دائر و سائر ہے وہاں نہ رہے گی، اسے سوچتے سوچتے اُس کی یہ حالت ہو جاتی کہ دل میں ایک اندیشہ پیدا ہوتا

آج ہی وہ ایسا نہیں کر رہی تھی۔ اُس کی یہ عادت تھی، صبح کو اُٹھتے ہی سب سے پہلے اپنے کمرے کے چھوٹے چھوٹے کام کرتی، بستر درست کرتی غسل خانہ میں جا کر دیکھتی کہ وضو کا پانی تیار رہے، کھڑکیاں کھولتی، میزوں کو صاف کرتی، سنگار میز کے آئینہ کو پونچھتی، کپڑوں کی الماریوں کا معائنہ کرتی اور ان تمام مشاغل میں جس سے ہر گھر کی بیوی تھوڑی بہت دلچسپی رکھتی ہے اُسے بہت بڑی لذت حاصل ہوتی، یہ عادت سالہا سال سے بلکہ بیاہ کے ابتدائی زمانہ سے لے کر عادت نہیں رہی تھی بلکہ اس نے ایک اٹل قانون کی شکل اختیار کر لی تھی جس کے اجرا میں کسی حالت میں بھی التوا جائز نہ تھا۔

اُس کے خیال میں گھر کی بیوی کے متعلق چند خدمتیں تھیں جنھیں کسی دوسرے کو سپرد کرنے سے بڑھ کر موجب عار کوئی اور سستی اور بے پروائی نہیں ہو سکتی تھی گھر کی زندگی کے متعلق تمام فرائض کو پوری ذمہ داری کے ساتھ ادا کرنا وہ اپنے اوپر لازم سمجھتی تھی اور اس معاملہ میں وہ اس درجہ پکی اور عزم پر وہ تھی کہ اُسے یاد نہیں آتا تھا کہ وہ ایک دن بھی اپنے مقرر قاعدہ کے خلاف گئی ہو۔ یہاں تک کہ جن خدمتوں کو اُس نے اپنے اوپر عاید کر رکھا تھا۔ اُن میں کسی اور کی تھوڑی سی شرکت یا معاونت کو بھی وہ اپنے حق میں ایک تجاوز خیال کرتی تھی اور بجائے

غیر منتظم حالت میں ڈال رکھا تھا اور یہ حالت اس کی طبیعت میں اُلجھن پیدا کرتی تھی، وہ فطرتاً نفاست پسند اور منتظم واقع ہوئی تھی۔

اُس کا خاوند بے پروا اور غیر منتظم تھا اور اس معاملہ میں خاوند کو اکثر اپنی بیوی کی گھڑکیاں سہنی پڑتیں، وہ جہاں بیٹھتا جلی ہوئی دیا سلائیوں اور آدھے استعمال کئے ہوئے سگرٹوں کے ڈھیر فرش پر لگا دیتا، حالانکہ اُس کے سامنے راکھ دانی رکھی ہوتی، وہ اسے انتظام سکھانا چاہتی۔ مگر اُس کا پھوڑپن نہ جاتا۔ غرض کہ آج بھی اُس نے تھوڑی دیر کمرے کے اس حالِ پریشاں کو دیکھا کہ کوئی چیز اپنی جگہ پر نہ تھی، پھر جھنجلا کے اُٹھی، پہلے چائے کی میز کو ایک طرف رکھا، کرسیوں کو ٹھیک کیا، کتابوں اور رسالوں کو جمع کیا، اصیل کو بُلا کے چائے کی کشتی اُٹھوائی، غسل خانے میں لوٹوں میں پانی بھر کے رکھنے کو کہا، چھوٹی چھوٹی بکھری ہوئی چیزوں کو اُٹھایا، الماری کو بند کیا، سب سے زیادہ بُری اُسے قالین پر پڑی ہوئی دیا سلائیاں اور سگرٹ کے خالی ڈبے معلوم ہوتے تھے، ایک ایک کرکے اُنھیں جمع کرتی جاتی ہے اور غصہ ہوتی جاتی ہے، ان چیزوں کو اُٹھا لینے کے بعد کمرے میں تھوڑی سی صفائی پیدا ہوئی تو اُس نے ایک لمبا سانس فراغت کا لیا اور پھر کھڑے ہو کر کمرے پر نظر دوڑائی کہ کن کن چیزوں کو ٹھیک کرنے کی اور ضرورت ہے۔

شروع کیا۔ اس صاف ہوا کے کھانے سے اُسے ایک شگفتگی معلوم ہوئی اور اس کے اعصاب میں سکون آیا، تھوڑی دیر کھڑکی کے پاس اسی طرح ٹھیری، اس کے پلنگ کے پاس آ کر اُس نے اپنی جرّابیں پہنیں، کمرہ ایسی گڑبڑ حالت میں تھا کہ اُس سے اُس کی طبیعت میں بہت اُلجھن پیدا ہوئی، کوچ کے پاس کل شام کی چائے کی چھوٹی میز مع چائے کے سامان کے رکھی ہوئی تھی جس کے اُٹھانے کا وقت نہ ملا تھا۔ پیالیاں میلی تھیں، پلیٹوں میں کچھ بسکٹ، کچھ میوہ کچھ کھایا کچھ بکھرا ہوا پڑا تھا، کوچ پہ کچھ کتابیں پڑی تھیں، کچھ اخبارات بکھرے ہوئے تھے، الماریوں میں کتابوں کی خالی جگہ اُنھیں زبانِ حال سے بُلا رہی تھی اخبارات اور رسالے ترتیب کے طالب تھے جنھیں اُس کے خاوند نے جھنجلاہٹ میں پڑھا تھا اور کسی رسالہ کے ورق انگلی ہی سے اس طرح بے پروائی سے کاٹے تھے کہ صفحوں کے متن کٹ گئے تھے، جلی ہوئی دیاسلائیاں اِدھر اُدھر بکھری پڑی تھیں، سگرٹ کی خالی ڈبیاں لڑھک رہی تھیں، ادھر ایک واسکٹ پڑی تھی تو اُدھر خاوند کے شب خوابی کے کپڑے پڑے تھے کرسیاں اپنی جگہ سے ہٹی پڑی تھیں ایک کالر فرش پر گرا پڑا تھا، میز پر تولیا، بنڈل بنی ہوئی پڑی تھی، ان چھوٹی چھوٹی چیزوں نے اِدھر اُدھر پڑ کر کمرے کو عجب

عذاب، ایک دائمی مجادلہ کے ساتھ اُٹھایا ہوا بوجھ ہوگی۔ لیکن کیا زندگی ان زحمتوں کی ارزش رکھتی تھی؟ وہ سوچتی تھی تو بجائے اُن آرزوؤں اور اشتیاقوں کے جو انسانوں میں جینے کے لئے پیدا ہوتے ہیں اپنے میں ایک ناامیدی کا احساس کرتی تھی جو بڑھتی ہی جاتی تھی، ہاں اب وہ کچھ بھی کرے، اس ماضی کا اعادہ جو ہر قدم پر دور ہوتی جارہی تھی ممکن نہ تھا، وہ سوچتی تھی کہ حقیر ہو کر زندہ رہنے میں کیا لطف ہے؟ دیکھ رہی تھی کہ اس کا خاوند اب اُسے نہیں چاہتا۔ اس کے ساتھ خوش نہیں رہتا۔ ایک مدت سے اس سے واقف تھی لیکن یہ خیال نہ کرتی تھی کہ وہ اس کے حق میں بے وفائی کرے گا۔ اس علم کے بعد کلیتاً بدبخت تھی۔

یہ سوچ کے کہ اگر ان خیالات میں اور زیادہ گہری گئی تو اس کی حالت خراب ہو جائے گی وہ اُٹھی کمرے ہی میں تھوڑی دیر ٹہلی اور پھر غسل خانے میں جا کر نہایت ٹھنڈے پانی سے مُنہ دھویا، دھویا کیا منہ پر چھینٹے مارے پھر آکر کمرے کی کھڑکی کھولی۔

اب کھڑکی کے پردے کو ہلاتی ہوئی، کوچ کی جھالر کو جنبش دیتی ہوئی بادِ صبا کمرے میں داخل ہوئی اور اُس نے لمبے لمبے سانس لے کر اپنے جگر کو بھرنا

کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ "بس اب مجھ سے یہ سہی نہیں جا سکتیں"۔ تو کیا ان باتوں سے واقف ہو کر بھی وہ کوئی آواز نہ نکال سکے گی اور اس سے یہی کہا جائے گا "اپنے خاوند کے ساتھ ناانصافی کرتی ہو حد سے آگے بڑھ رہی ہو"۔ وہ کب حق پر تھی؟ حیاتِ ازدواج کے شروع کے زمانہ سے لے کر اب تک تمام لڑائیوں اور اختلافات میں کیا ہمیشہ وہ مغلوب نہیں رہی تھی؟ یہ خیال اُسے متاثر کرتا ہی اور اپنے آس پاس ایک بھی قلبِ مشفق نہ پاکر جو اُس کے ساتھ ہمدردی کرے وہ ایک الیم بیکسی کا احساس کرتی تھی، اب تک کسی سے اُس نے اپنے اس حال کا ذکر نہیں کیا تھا اور ہمیشہ خوش و خرم نظر آنے کی کوشش کی تھی، حال آنکہ کس قدر بدبخت تھی!

اب اس بدبختی کی تلخی کو زیادہ وضاحت سے محسوس کر رہی تھی اور یہ سوچ سوچ کر کہ ابتدائی ایام کی خوشیاں پھر عود نہ کریں گی مایوس ہوتی تھی، آہ! اُس وقت کیسا ایک دوسرے کو چاہتے تھے! لیکن اب اُس بیوی سے جس کی ایک زمانہ میں پرستش کی جاتی تھی بھاگا جاتا ہی، یہاں تک کہ اُس کی بدگمانیاں بھی جس میں وہ بالکل حق بجانب تھی سہی نہ جاتی تھیں۔ تو گویا اُس کے بعد یہ سلسلہ یوں ہی رہے گا، زندگی ان میاں بیوی کے لئے ایک ناقابلِ برداشت

بڑھ گئی تھی گھبرانے لگی، ممکن ہے کہ یہ خط سوائے اس کے کچھ اور نہ تھا کہ ایک
دوست کے نام ایک کاغذ ہو، اب اپنے ظنیات اور اپنے خاوند کے بیانات کے
درمیان مطابقت کا پہلو ڈھونڈنے لگی اور ان دو شقوں میں سے کہ اس کے
شبہات اپنے خاوند کے متعلق پایۂ ثبوت کو پہنچ چکے ہوں یا یہ کہ وہ اپنے خاوند کے
خلاف ناانصافی کی متہم ہو۔ دوسری شق کو آسان سمجھتی تھی، لیکن ساتھ ہی ایک
شبہ ان تاویلات کی کمر توڑ دیتا اور سہر محاکمہ کو درہم برہم کر دیتا، یہ مانا کہ یہ عورت
اُس کی دوست تھی اور اس کے کسی دوست کی بیوی تھی مگر اس کا کیا جواب کہ
وہ اُسے "ڈارلنگ" سے خطاب کر رہا تھا، اسے بھی چھوڑیئے۔ اس کا کیا
جواب کہ پنہاں طور پر اک موعد ملاقات مقرر کیا جا رہا تھا، اس نکتہ کو اس سے
پہلے کیوں اُس نے خیال نہیں کیا تھا، بس اب معلوم ہو گیا کہ اس معاملہ میں
جو کچھ عذرات اور تاویلات وہ پیش کیا کرتا تھا وہ سب جھوٹ تھے اور کون کہہ سکتا
ہے کہ اس طرح سویرے اُٹھ کے بھاگ کر جانا اس خیانت کی ایک برہان صریح
نہ تھا شاید کہ اس لمحہ میں وہ اُس عورت کے آغوش میں تھا، اپنے تصورات کو
اُس نے ذرا اور آگے بڑھایا اور یہ سوچا کہ شاید اس وقت وہ اُس عورت کے
سامنے اپنی بیوی کی بدگمانی، رشک، تنگ مزاجی کی دل کھول کر شکایت

آہ! اس وقت وہ کیا کرے گی؟ کیا اپنے ہاتھوں اس تمام سامان کو جو اس قدر رشک کا باعث تھا پیدا نہیں کرے گی؟ اسے سوچ کر خود ہی نادم ہوتی اور پھر ان تمام سیاہ حقیقتوں پر پردہ ڈالنے کے لیے کوشش کرتی اور یہ یقین کرنا چاہتی کہ اگر اُس سے جدا ہوئی تو زندہ نہ رہ سکے گی۔

اس کا خیال بھی اُسے خوف زدہ کر دیتا تھا۔ تو کیا یہ حالت یوں ہی رہے گی اور وہ اپنے حق کی مدافعت میں ایک ناتوان آواز بھی نہ نکال سکے گی؟ ......

اس لمحہ میں اُس نے اپنے تئیں اس قدر حقیر و ذلیل پایا کہ اُس کی روح کی گہرائیوں میں سے وقارِ نسوانی کا ایک سیلاب جوش مارنے لگا اور اس نے پھر مقابلہ کا ارادہ کیا لیکن ایک سکنڈ میں اُس مقہوریت کے ساتھ جو اُس کی تمام معنوی قوتوں کو توڑ رہی تھی اُس نے پھر حقیقت کی طرف عود کیا۔ کیا فائدہ جب کہ وہ اُسے اس درجہ چاہتی تھی؟

اس کے بعد اُس نے ان اسباب پر غور کرنا شروع کیا جن کی بنا پر وہ اس طرح سویرے اُسے خبر کیے بغیر چلا گیا تھا۔ کیا حقیقت میں وہ اس سے ناراض ہو گیا تھا؟ اس احتمال نے اسے اتنا ڈرایا کہ ابھی ذرا سی دیر قبل کے تفکرات و تقریرات پر خود ہی نادم ہونے لگی اور یہ خیال کر کے کہ وہ ذہنًا حد سے کچھ آگے

گیا تھا، ہر ایک بات جتلا دی تھی اور اب یہ شبہات ایک منٹ میں درجۂ یقین کو پہنچ گئے تھے، اُس کا خاوند ایک میم کو چاہ رہا تھا، یہ بات اب محقق تھی کہ اُس کا خاوند اُس کے حق میں خیانت کر رہا تھا یہ پوری طور پر ثابت تھا لیکن وہ اس کی بے وفائیوں، اُس کی خیانتوں کے باوجود اُسے چاہتی تھی۔

یہ سوچ کر وہ خود اپنے اوپر غصّہ ہوتی اور اس حِس پر جس نے اُسے اس درجہ مغلوب کر رکھا تھا لعنت بھیج کر وہ کہتی "لیکن یہ محبّت نہیں ذلّت ہے"۔

اس کے بعد ایک فیصلہ کرتی، اگر یہ حالت قائم رہی تو وہ اس کے ساتھ زندگی بسر نہ کرے گی اور اس سے اس طرح قطع علاقہ کرے گی کہ پھر اس کے پاس نہ آئے گی۔ ہاں، ضرور علیٰحدہ ہو جائے گی، یہاں اُس کا ذہن ایک سکنڈ کے لئے ٹھیرا اس کے بعد اس نے اس فیصلہ کے طریقۂ اجرا پر غور کیا، جب کہ وہ کسی دوسری کو چاہ رہا تھا تو کیا وہ اس سے یہ کہے گی کہ مجھے چھوڑ دو؟ اور اس خیال نے آہستہ آہستہ اُس کے ذہن میں اپنی پوری تاثیر سے بڑھنا اور کسبِ اہمیت کرنا شروع کیا۔ لیکن اسی دقیقہ میں اُس نے ذہناً اپنے تئیں متروک دیکھا اور وہ کانپی، اُس کے دماغ میں یہ نقشہ کھنچا کہ اُس سے آزاد ہو کر خاوند سیدھا اپنی محبوبہ کی آغوش میں گرنے کے لئے جا رہا ہے۔

یہ معلوم کرکے وہ بالکل دہم میں پڑ گئی! کیا وہ اُس سے ناراض ہو گیا تھا؟
اس اندیشہ سے اُس کا دل ایک دم گھٹ کرکے دھڑکا اور اپنے میں کھڑے
رہنے کی قوت نہ پاکر وہ ایک آرام کرسی پر گر پڑی، تمام رات چادر میں مُنھ
سپیٹے جن آنسوؤں کو وہ روکے رہی تھی بحران کے اس دقیقہ میں جب کہ
طغیانِ گریہ اُٹھا تو اُس نے انھیں بہنے کی خوب اجازت دی اور پھوٹ
پھوٹ کے روئی۔

اے میرے خدا، یہ اس طرح کیسے گزرے گی؟ اس زندگی کو جو ہر دن
اُسے تھوڑی سی مسموم کر جاتی، آہستہ آہستہ خراب کر جاتی تھی کیسے برداشت
کرے گی؟ رشک کی یہ کیفیت بھی شاید اپنے خاوند کے حق میں ضرورت سے
زیادہ بے انصافی تھی مگر یہ اُس کے اختیار کی بات نہ تھی، وہ اسے اب تک
ابتدا کی حرارتِ محبت کے ساتھ چاہتی تھی اور وہ اس تمام محبت کو، عورت کے
دل کو لبریز کرنے والے حیاتِ مقدس کو پاؤں تلے روند رہا تھا، کسی دوسرے کو
چاہ رہا تھا۔ ایک مہینے سے اس سے واقف تھی۔ اُس وقت سے دل شکن شبہات
اُسے خراب کر رہے تھے لیکن کل جب کہ وہ اپنے خاوند کی میز کے کاغذات
درست کر رہی تھی اُسے ایک خط کے مسودہ نے جو بلا شبہ بھولے سے پھاڑا نہیں

آئینے کے سامنے

آج صبح نہایت سویرے جب اُس نے دیکھا کہ اُس کا خاوند چپکے سے اُٹھ کے اُس کو جگائے بغیر اور اُس کی مدد بغیر کپڑے پہن کے باہر چلا گیا ہو تو اُسے ایسا معلوم ہوا کہ اُس کا دل پس گیا؛ اُس کی ساری رات ایک عصبی بحران میں گزری تھی لیکن اب وہ ایک دفعہ تیزی سے اُٹھی، اصیل کو آواز دی؛ اتنے وہ آئے آئے ایک ذہن کو زیروزبر کرنے والے سوچ میں پڑ کر کمرے ہی میں مضطرب حالت میں اِدھر اُدھر ٹہلی۔

اصیل کے آتے ہی اُس سے پوچھنے لگی: "کیا وہ باہر گئے؟"

وہ جا چکے تھے، اُنھیں گئے ہوئے ایک گھنٹے سے زیادہ ہو چکا تھا۔

حکایات

نوٹ

افسانہائے عشق، گُم نام خطوط، بزمِ رفتگاں، کوسم سلطان، مادرِ وطن، ویران صنم خانے، جدید ترکی کی عدیم المثال مصنفہ اور وطن پرست خالدہ خانم ادیب کی سحر آفریں تخیل کا نتیجہ ہے۔

آئینے کے سامنے، تیتری، ایک مغنیہ سے التجا، عورت کا انتقام، داماد کا انتخاب، دوسرے ترکی مصنفین سے بہ تصرف لئے گئے ہیں۔

باقی مضامین طبع زاد ہیں۔

یہ تمام مضامین مختلف رسالوں (ہمایوں، علی گڑھ میگزین، مخزن وغیرہ) میں شائع ہو چکے ہیں۔

سجّاد

فہرستِ مضامین

حکایات

اقتباسات

پُرانا خواب
اور
دو اور افسانے

مترجمہ

سید سجاد حیدر

(یلدرم)

یہ تین ترکی افسانوں کا مجموعہ ہے یعنی (۱) پُرانا خواب - ایک نہایت دل کش و دل دوز ڈراما (۲) آسیبِ الفت - ایک مردہ عورت کی روح کی زبانی اُس کی داستانِ عشق (۳) مطلوبِ حسیناں - ایک تُرک نوجوان اور ایک فرانسیسی لیڈی کی رودادِ محبت

اس مجموعہ کی قیمت عہ/۸

یہ تینوں افسانے علیٰحدہ علیٰحدہ بھی شائع کئے گئے ہیں :

پُرانا خواب .. .. قیمت فی جلد	۱۰/
آسیبِ الفت .. .. "	۱۲/
مطلوبِ حسیناں .. .. "	۸/

ملنے کا پتہ

شیخ مبارک علی صاحب تاجر کتب اندرونِ لوہاری دروازہ - لاہور

دار الاشاعت پنجاب ۱۹۵ ریلوے روڈ - لاہور

مسلم یونیورسٹی بک ڈپو - علی گڑھ

تصانیف سیّد سجاد حیدر صاحب بی اے

خیالستان

(مختصر افسانوں اور مضامین کا مجموعہ)

مشہور اخبار زمیندار اس کتاب کے متعلق لکھتا ہے:-

دارالاشاعت پنجاب نے اُردو پر بہت ہی بڑا احسان کیا ہی کہ ادیب جلیل سیّد سجاد حیدر صاحب کی مشہور و مستغنی عن التحسین کتاب خیالستان کا دوسرا ایڈیشن شان دار ساز و سامان کے ساتھ چھاپ دیا ۔۔ ۔۔ ہمارا ذاتی عقیدہ ہی کہ اُردو زبان کی ادبیات لطیفہ میں خیالستان سے بہتر کتاب نہیں اس کتاب کا چوتھا ایڈیشن ہی قیمت ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ عہ

ثالث بالخیر

"یہ ایک ترکی فسانہ نگار احمد حکمت کے ناول کا ترجمہ ہی جو ملک کے مشہور ادیب سیّد سجاد حیدر صاحب نے کیا ہی۔ ترکی فسانوں کی لطافت و نزاکت تمام دنیا میں مشہور ہی۔ ترکوں نے ادب لطیفہ کو درجۂ کمال تک پہنچا دیا ہی۔ یہ ناول اگرچہ چھوٹا ہو مگر جذباتِ لطیفہ کے لئے اپنے اندر بہت سامان رکھتا ہی" (اقتباس از اخبار زمیندار) قیمت ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ہر طبع

سلسلۂ کہکشاں

حکایات و احتساسات

(یعنی مختصر افسانوں اور مضامین کا دوسرا مجموعہ)

از

سید سجّاد حیدر صاحب بی اے

ڈپٹی کلکٹر ہردوئی (یوپی)

مصنف "خیالستان" مترجم جلال الدین خوارزم شاہ وغیرہ

باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی

مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ میں طبع ہوا ۱۹۳۰ء ۱۳۴۸ھ